مرزا غالب
رائل پارک میں
اے حمید

MIRZA GALIB RAYAI PARK MEH.

BY

A. HAMEED.

PRICE. RS: 12/-

اے حمید

بار اول :- .... جون ۱۹۸۰ء

قیمت :- .... بارہ روپے ۱۲/۰

(نعمانی پریس دہلی)

آہلووالیہ بُک ڈپو 9953/4 نیو روہتک روڈ

پوسٹ بکس نمبر 2507 نئی دہلی نمبر ۵ ۱۱۰۰۰۵

لاہور آکر مرزا غالب کی حالت بہت پتلی ہوگئی۔ وہ اس ادب ساز شہر
میں محض اس خیال سے چلے آئے تھے کہ یہاں ان کے ذوق کی تسکین ہوگی۔
اور وہ شعر و سخن کے ماحول میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کریں گے۔
لیکن معاملہ الٹا نکلا۔ یہاں انہوں نے آتے ہی جس معاشرے میں شرکت
کی وہاں لوگوں نے وہ اُودھم مچایا کہ مرزا صاحب ہکا بکا ہو کر رہ گئے۔ جو بھی
شاعر سٹیج پر غزل پڑھنے آتا لوگ تالیاں بجا کر اس کا خیر مقدم کرتے۔
اور جوتے کرسیوں پر بجا بجا کر اُسے رخصت کرتے۔ اس کے ہر شعر پر مُرغ بن کر
اذانیں دیتے۔ بکرے کی طرح ممیاتے اور بلی کی طرح غراتے اور شاعر سے
استدعا کرتے کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو سٹیج پر سے تشریف لے جائے۔
جب غالب کی باری آئی تو وہ کانپتے ہوئے اٹھے اور لڑکھڑاتے قدموں
کے ساتھ چل کر سٹیج پر آگئے۔ صدر نے اعلان کیا کہ اب تاجدارِ شعر خاقانی زماں

جناب اسداللہ خاں غالب دہلوی اپنے کلام بلاغت نظام سے حاضرین کو مستفیض فرمائیں گے۔

لوگوں نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ تالیاں بجائیں اور کتنی ہی دیر تک تالیاں بجاتے رہے اور غالب کو شعر سنانے سے باز کئے رکھا۔ جب غالب نے دیکھا کہ لوگ باز نہیں آتے تو انہوں نے اپنا پرانی وضع کا تاتاری کنٹوپ اتار سر پہ ہاتھ پھیرا اور شعر پڑھنا شروع کیا۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

ابھی انہوں نے دوسرا مصرعہ پورا نہیں کیا تھا کہ لوگوں نے آوازے کسنے شروع کئے۔

"نقش فریادی۔ واہ واہ یہ تو فیضی کے مجموعے سے نام اڑایا ہے"

"دوسرا مصرعہ کل سنائیے گا۔"

"کوئی تازہ کلام سنائیے۔ یہ تو ہم آپ کے دیوان میں پڑھ چکے ہیں۔"

غالب نے دوسرا مصرعہ پڑھا۔ پھر دوسرا شعر کہا۔

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ

اس پہ چاروں طرف "ستم جانی ہائے ہائے جانی" کے نعرے بلند ہونا شروع ہو گئے۔

غالب نے کنٹوپ پہ ہاتھ پھیرا اور وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئے۔ کچھ روز یونہی شہر میں پھرتے پھراتے رہے۔ ایک انجمن مجلس والوں کو معلوم ہوا کہ غالب صاحب لاہور میں آئے ہوئے ہیں۔ تو وہ فوراً ان کی خدمت میں

حاضر ہوئے اور چھپا ہوا پروگرام پیش کر کے کہا۔
ہم نے اس ماہ کے آخری ہفتے میں آپ کی غزل پروگرام میں رکھ لی ہے۔ آنا مت بھولئے گا۔"
غالب پروگرام کا پرچہ ہاتھ میں لے کر اسے پڑھتے رہ گئے۔ آخر انہوں نے پوچھ لیا۔
"کیوں صاحب! آپ اس کے معاوضے میں کتنے پونڈ دیں گے۔؟"
سیکرٹری نے حیران ہو کر غالب کی طرف دیکھا۔
"کیا کتنے پونڈ دیں گے۔؟"
"میرا مطلب ہے پونڈ کتنے دیں گے۔؟"
"دیکھئے مرزا صاحب یہاں پونڈ آدھ سیر کو کہتے ہیں۔ آپ کہیئے آپ آدھ سیر کیا چاہتے ہیں؟ دال، قند، بنولے کھلی یا نسوار
غالب نے کہا۔
"میرا مطلب معاوضے کی رقم سے ہے۔ دیکھئے نا میرا شاگرد حالی ایک غزل کے ......"
سیکرٹری نے مسکرا کر کہا۔
"اچھا اچھا میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ تو ہم آپ سے صرف پانچ روپے ایک غزل کے وصول کریں گے۔ اسی طرح سے آپ ہماری مجلس کے ممبر بھی بن جائیں گے۔ دیکھئے نا حالات بڑے خراب ہیں۔ مشاعروں کی ٹکٹیں بڑی مشکل سے فروخت ہوتی ہیں۔ اچھا بائی بائی۔"

دوسرے روز ایک مدّاح نے ان کی دعوت کی بڑی اعلیٰ قسم کی شراب لاکر رکھی۔ خوب کھانا کھلایا، میز پہ جو دسترخوان بچھایا اس پہ مہمان کی آمد پہ خوشی کے اشعار بھی لکھے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا۔

"اب تو آپ آگئے ہیں۔ خیر کھانا کھالیں لیکن پھر ادھر کا رُخ نہ کریں۔"

غالب صاحب مرزا نے پہ شرم سے پانی پانی ہوتے رہے مگر کیا کرتے۔ مجبور تھے۔ پیٹ بڑی بُری بلا ہے۔ کھانا زہر مار کیا اور اپنا سا منہ لیکر باہر نکل گئے

اب شہر میں غالب کی آبرو نہ رہی، ان کی حالت خراب ہونی شروع ہو گئی۔ صبح سے شام مال روڈ کے چکر لگاتے۔ کافی ہاؤس میں دن بھر بیٹھے مکھیاں اُڑایا کرتے، لائبریری میں جاکر اپنے فن پہ لکھی ہوئی کتابیں تنقیدیں اور شرحیں پڑھتے۔ اور سر دُھنتے۔ شرحیں لکھنے والوں نے ایسے ایسے الفاظ پیدا کئے تھے جو غالب کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔

آخر جب حالت زیادہ پتلی ہو گئی۔ تو کسی نے انہیں کہا کہ فلم میں قسمت آزمائی کرنی چاہیئے۔ وہاں آپ کیلئے بڑا چانس ہے۔ چنانچہ مرتا کیا نہ کرتا۔ غالب صاحب نے رائل پارک کا رُخ کیا۔ رائل پارک چوک میں آکر وہ ایک پنواڑی کی دوکان کے آگے کھڑے ہو گئے۔ جیب سے اِکنّی نکال کر پان والے سے کہا۔

"میاں ایک گلوری تو بناؤ۔"

پنواڑی نے پوچھا۔

"کیوں جی پان میں کیا ڈالوں۔؟"

"بس میاں تھوڑا سا زردہ اور رنگ تری ایک رتی مشک بادیان، اور

۲ ماشہ رتی عنبر زعفرانی ڈال دو۔"

تمباکو والے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بولا ۔

"حاجی جی! یہ نسخہ تو کسی حکیم کی دکان پہ ہی آپ کو ملے گا۔ میرے پاس تو صرف تمباکو ہے۔ کہو ڈال دوں ۔"

سخت مایوسی کی حالت میں غالب صاحب نے پان لیکر کلے میں دبالیا۔

اسی ہفتے انہیں ایک فلم کے گیت مل گئے دوپہر کو پروڈیوسر اور ہدایت کار نے شراب منگوائی اور دور چل پڑا۔ غالب کو دعوت دی تو انہوں نے کہا ۔

"حضور بھلا یہ کوئی وقت ہے۔ بادہ نوشی کا ہم نے شب ہتاب میں پیتے ہیں اور جب قدر مل جائے پیتے ہیں ۔"

"ذرا چکھئے تو غالب یار ۔"

مجبوراً غالب نے ٹھرے کا ایک گھونٹ پی لیا۔ گھونٹ کا اندر جانا تھا کہ غالب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ۔ سر کے بال کھڑے ہو گئے۔ کنٹوپ اچھل کر دور جا گرا۔ آنکھوں میں ڈھیلے کھلتے لگے۔ کانوں سے دھواں نکلنا شروع ہو گیا۔ ایک چکر کھایا اور فرش پہ گر کر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگے اور بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو نقاہت کے مارے بولا نہیں جاتا تھا۔ اسی دن سے توبہ کی کہ ٹھرہ کو پھر ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔

اب فلم کے گیت لکھنے شروع کئے۔ ہدایت کار نے ایک محل بتایا کہ ہیروئین ہیرو کی یاد میں اشکبار ہے۔ جو اسے چھوڑ کر کسی دوسری عورت کے ساتھ بھاگ گیا ہے۔ اس پر غالب صاحب نے سوچ کر کہا۔

میرے پاس اس محل کیلئے ایک بہترین غزل پڑی ہے۔
عرض کیا ہے۔
اور اس کے بعد غالب نے ترنم سے شعر پڑھا ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا ۔!

کیا خیال ہے ؟
ہدایت کار نے سر پکڑ لیا۔ بال نوچ کر بولا ۔
" آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ غالب صاحب یہاں یہ آپ کی غزل نہیں چلے گی۔ یہاں تو کچھ اس قسم کا مصرعہ لکھیں ۔

بلم ہرجائی نکلا
وہ میرا بھائی نکلا
پورا قصائی نکلا
ذات کا نائی نکلا
بلم ہرجائی نکلا ۔

اب غالب صاحب نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ہدایت کار نے دوسری سچویشن بیان کی ۔
" منظر یہ ہے کہ ہیرو پاگل ہو گیا ہے محبت میں دیوانہ ہو کر گلیوں میں پھٹے حالوں میں پھر رہا ہے ۔ اور پُرسوز آواز میں گا رہا ہے ۔
غالب نے ٹوپی اُتار کر پٹخ دیا اور سر کھجا کر دماغ پہ زور دیکر بولے ۔

"آگیا مکھڑا۔"

"سبحان اللہ"

ہدایت کار نے اچھل کر کہا۔ غالب نے ترنم سے مکھڑا سنایا۔ عرض کیا ہے

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

ہدایت کار نے سر پیٹ لیا۔ فوراً منشی کو بلا کر کہا۔

"مسٹر غالب کو سٹوڈیو سے رائل پارک تک کا گاڑی کا کرایہ دے کر یہاں سے چلتا کرو۔"

غالب صاحب اس کا منہ ہی تکتے رہ گئے اور ہدایت کار سگریٹ پھینک کر باہر نکل گئے۔ دوسرے روز غالب نے اپنا ایرانی جُبہ، کنٹوپ اور تاتاری چپل بیچ کر ریل کے کرائے کا بندوبست کیا۔ اور شعر پڑھتے اپنے مقبرے کی طرف روانہ ہو گئے ؎

اسد اللہ خاں تمام ہوا!
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

جنّت میں شوٹنگ

موتی بی گڈوانی اور دادا بھائی پھالکے کو جنت میں رہتے رہتے جب کافی دیر ہو گئی اور وہ پھولوں کے ہار گلے میں ڈال کر باغ عدن کی سیریں کرتے اور شہد کی نہروں کے شہد کھاتے کھاتے تنگ آ گئے تو انہوں نے ایک روز بیٹھ کر آپس میں مشورہ کیا کہ آخر اس طرح بیکار کب تک بیٹھے رہیں گے کیوں نہ ایک فلم کمپنی سٹارٹ کر دی جائے اور فلم بنایا جائے۔

پھالکے صاحب نے کہا۔

,,لیکن گڈوانی صاحب! اب تک جو آرٹسٹ جنت میں آئے ہیں وہ بڑے بوڑھے ہو کر دنیا سے آئے ہیں۔ مثلاً مجن ہے وہ یہاں سے تین کروڑ میل ایک ایسے ستارے میں رہتی ہے۔ جہاں ہم نہیں جا سکتے؟

گڈوانی نے کہا۔

"تو بھپلکے دادا، اس کا کیا کیا جائے؟ میں نے سنا ہے کہ لاہور اور بمبئی میں فلم انڈسٹری نے بڑی ترقی کرلی ہے اور ایکٹر بہت کم بیمار ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے تو ان کے یہاں آنے میں بڑی دیر لگ جائے گی۔ نہ وہ بیمار ہو کر سورگباشی ہوں گے اور نہ یہاں آئیں گے۔"

بھپلکے صاحب نے کہا۔

"گڈوانی صاحب! پہلے ہم فنانس اکٹھا کرکے فلم کمپنی تو سٹارٹ کریں۔ بھگوان نے چاہا تو ایکٹر ایکٹریسیں بھی زمین سے آجائیں گی۔"

"لیکن فنانس کون لگائے گا۔؟"

"میرا خیال ہے جنّت کے داروغہ سے بات کی جائے۔"

"نہیں! پہلے اس ٹھیکیدار سے بات کی جائے جس کے پاس جنّت کی نہر دودھ اور باغ کی روشوں اور سنگ مرمر کے محلات کی مرمت کا ٹھیکہ ہے۔"

"تو چلیئے۔"

دونوں حضرات مل کر پہلے جنّت کے داروغہ کے پاس گئے۔ جب ساری سکیم اس کو سمجھائی گئی۔ تو اُس نے کانوں پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میری تو یہ ہے بھائی۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے دوزخ میں اسی قسم کی ایک فلم کمپنی بنی تھی میں نے اس میں اپنی ساری پونجی لگادی تھی لیکن وہ لوگ میرا سارا مال ہضم کر گئے۔ جب میں نے ان سے شکایت کی تو کہنے لگے تم ہمارا کیا بگاڑ لو گے؟ ہم تو پہلے ہی دوزخ کی آگ میں جل رہے ہیں۔ بس صاحب اس کے بعد تو میں نے کانوں پہ ہاتھ رکھ لئے ہیں۔"

دونوں پروڈیوسروں نے ناکام ہو کر جنّت کی نہروں اور محلوں کے ٹھیکیدار سے بات کی۔ ٹھیکیدار نے بڑے غور سے ان کی سکیم سُنی، پھر کہنے لگا۔

"سکیم تو آپ کی خوب ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کہیں بھگوان ناراض نہ ہو جائیں"

بھالکے صاحب بولے۔

" فکر نہ کرو، ہم پہلے تمہارے بھگوان سے اجازت لے لیں گے اگر وہ نہ مانا تو اس کو اپنی فلم میں کیریکٹر دے دیں گے پھر وہ ضرور مان جائے گا"

ٹھیکیدار نے کہا۔

" مگر میرے پاس روپیہ کم ہے کیونکہ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جنّت میں رشوت بالکل نہیں چلتی۔ دوزخ میں جو میرا ایک یار ٹھیکیدار ہے وہ لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔ اسکے پاس دوزخ کے تنوروں میں لکڑیاں اور پتھر کا کوئلہ سپلائی کرنے کا ٹھیکہ ہے لیکن میں رشوت بالکل نہیں لیتا۔ تو حلال کی کمائی کا بنا بنایا ہے۔ وہ میں حاضر کر دوں گا۔ بھگوان کرے کہ آپکی فلم پاس ہو جائے۔ مگر یہاں تو اچھی ایکٹریسیں کوئی بھی نہیں ہے۔ ایک ڈانسر ہے جو دوزخ میں ہے"

" ہم اس کو یہاں لانے کی کوشش کریں گے"

" دوزخ والے نہیں مانیں گے"

" ہم انہیں رشوت دے دیں گے"

" بہت خوب۔ تو لیجئے یہ بیس ہزار کی رقم حاضر ہے"

روپے آ گئے تو بھالکے صاحب اور گدوانی صاحب نے جنّت کے ایک بارونق بازار میں "موڈرگ فلم کمپنی" کے نام سے دفتر کھول لیا۔ انہوں نے اخبار میں

پبلسٹی بھی کرنی شروع کردی اور نئے چہروں کے لئے اشتہار بھی دے دیا۔ مگر جنّت سے کسی بھی نیک بی بی نے ادھر توجہ نہ کی۔ البتہ دوزخ میں سے لڑکیوں اور لڑکوں کے خط اور تصویریں آنا شروع ہو گئیں۔ سوال یہ تھا کہ انہیں جنّت میں کیسے لایا جائے۔ بھولکے صاحب اور گڈوانی صاحب نے اس سلسلے میں دوزخ کے داروغہ سے ملاقات کی۔ دوزخ کے داروغہ نے انکار کر دیا، اور کہا۔

"بھائی صاحب! ہم دوزخ والوں کی انہی ٹرانسفروں سے رونق ہے۔ اگر یہ یہاں سے چلی گئیں، تو یہاں الّو بولنا شروع ہو جائیں گے۔ آپ لوگ جنّت میں رہتے ہیں آپ کو کس چیز کی کمی ہے۔؟"

دونوں پروڈیوسر بڑے پریشان ہوئے اب وہ انہیں کیسے سمجھاتے کہ فلم بنانے کے لئے تھوڑی بہت دوزخ سے مدد لینی ہی پڑتی ہے۔ چارہ ناچار وہ زمین سے آنے والے ایکٹروں کا انتظار کرنے لگے۔

اس دوران میں ان کی ملاقات کسی طرح شیطان سے ہو گئی۔ شیطان جنّت میں تو نہیں آسکتا تھا۔ لیکن اس نے انہیں کسی طرح جنّت میں ٹیلی فون کر دیا، اور زمین سے آرٹسٹوں کو لانے کی پیش کش کر دی۔ بھولکے صاحب نے کہا۔

"شیطان بھائی اگر تم یہ کام اپنے ذمے لے لو تو ہم تمہیں کمپنی کا پروڈکشن کنٹرولر بنا دیں گے، اور تمہاری تنخواہ ایک ہزار روپے ماہوار کر دیں گے"

شیطان نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"تم مجھے کیا تنخواہ دو گے۔ زمین سے لوگوں کو ورغلا کر ادھر لانا ہی میری

سب سے بڑی تنخواہ ہو گی۔"

چنانچہ شیطان نے دوسرے روز ہی زمین کا رُخ کیا زمین پر آ کر اس نے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ کسی کو اس نے اقتصادی پریشانیوں کا شکار کر دیا۔ کسی پہ بیماری بن کر حملہ آور ہوا اور کسی کے پاس دیسی شراب کا روپ بدل کر پہنچ گیا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ زمین سے آرٹسٹ اُوپر آنا شروع ہو گئے۔ پہلے سہگل آیا۔ اس کے استقبال کے لئے پروڈیوسر صاحبان نے زبردست تیاریاں کر رکھی تھیں۔ ایکسٹرا لڑکیاں باغ میں جھولا ڈالے "جھولا جھلا رہی گوری" گا رہی تھیں اور کہیں "بالم آئے بسو مورے من میں" گایا جا رہا تھا۔

سہگل کی ایک زبردست دعوت دی گئی۔ اسے ایک عالیشان فلیٹ میں رکھا گیا۔ اور دوسرے آرٹسٹوں کا انتظار شروع ہو گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد کاریپ کور آ گئے۔

پیالکے صاحب نے کہا۔

"گڈوانی صاحب! دیسیپ تو آ گئی اب ایک ہیروئن کی ضرورت ہے جو باقی رہ گئی ہے۔"

"دادا! شیطان کی مدد ساتھ رہی تو وہ بھی آ جائے گی۔"

ابھی تھوڑے دن ہی گذرے تھے کہ پروڈیوسروں نے جنت کے اخبار میں بالو کی آمد کی خبر سنی۔ اخبار والوں نے سفید حاشیہ کھینچ کر یہ خوشی کی خبر شائع کی تھی۔ دونوں پروڈیوسر بالو کا استقبال کرنے جنت کے دروازے پر گئے۔ اسے بڑے اہتمام سے کمپنی کے دفتر میں لایا گیا۔ بالو کچھ تھکی تھکی سی تھی۔ اس نے کہا کہ میں

کافی دیر بیمار رہ کر یہاں آئی ہوں اس لئے ذرا تھکی تھکی ہوں۔ دو ایک روز تک ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

ہیروئن، ہیرو، پن بابو، اور دیپ کلدیپ کور فلمی تکون پوری ہو گئی تھی۔ فلم کی کہانی لکھ کر تیار کر دی گئی۔ اس دوران میں مشہور ایکٹر چندر موہن بھی تشریف لے آئے۔

اس نے آتے ہی جنت کے داروغہ سے پوچھا۔

"رضوان! کیا تم ماید ولت کو بتا سکتے ہو کہ جنت میں ہمارا محل کہاں ہے۔ ہم اپنے محل میں جانا چاہتے ہیں۔"

وہ ابھی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ پروڈیوسر حضرات وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے چندر موہن کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے دفتر لے آئے۔

اب میوزک ڈائریکٹر کی کسر رہ گئی تھی۔ کیونکہ گانے لکھنے والا اشرف وہاں پہلے ہی سے آ گیا تھا۔ اور گیت لکھنے اُس نے شروع کر دیئے تھے۔

ایک روز پروڈیوسر صاحبان اپنے دفتر میں اُداس بیٹھے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ بھاٹیہ صاحب نے رسیور اٹھایا۔

"ہیلو!"

ہیلو! اس زمین سے شیطان بول رہا ہوں۔ اس وقت میں لاہور میں ہوں، ماسٹر غلام حیدر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔

مبارک ہو۔

فون بند ہو گیا۔ پروڈیوسروں کے چہرے چمک اُٹھے۔ وہ بھاگم بھاگ

جنّت کے دروازے پر خیر مقدم کو گئے۔ ماسٹر غلام حید رصاحب کفن بردوش سفید پھولوں میں لدے پھندے چلے آرہے تھے۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اب پروڈیوسروں کے چہرے بھی مسکرا رہے تھے۔

اب فلم کی سکرپٹ پر زور شور سے کام ہونا شروع ہو گیا۔ ماسٹر صاحب نے گیتوں کی دُھنیں بنانا اور سہگل کو ریہرسل کروانا شروع کر دیں۔ سکرین پلے کا کام تیزی سے ہونے لگا۔ ایک روز پھر شیطان کا ٹرنک کال آیا۔

"میلو! میں بمبئی سے بول رہا ہوں۔ ابھی ابھی میں نے گھوڑا بن کر شیام کو اپنے اوپر سے گرا کر ہلاک کر دیا ہے۔ مبارک ہو۔"

پروڈیوسروں کو بھی خوشی ہوئی اور صدمہ بھی کہ یہ شیطان کا بچّہ زمین پہ جا کر تو لوگوں کا خانہ خراب کر رہا ہے۔

ایک ہفتہ کے اندر اندر مظہر خان، مجید، الناصر، نایاب، سرمدی اور علی بابا بھی جنّت میں پہنچ گئے۔ یہ لوگ تو اخبار میں فلم کا اشتہار پڑھ کر خود فلم کمپنی کے دفتر میں آ گئے۔

بھالکے صاحب بولے۔ "اب تو دو فلمیں بنانا پڑیں گی۔"

گڈوانی صاحب نے کہا۔

"بھالکے دادا آپ فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم دونوں فلمیں بیک وقت سٹارٹ کریں گے۔"

"لیکن دوسری فلم کا فنانس کہاں سے آئے گا۔ ؟"

"میں نے اس شخص سے بات کر لی ہے جس کے پاس جنّت میں بجلی اور پانی

سپلائی کرنے کا ٹھیکہ ہے۔ وہ راضی ہو گیا ہے۔"

" یہ تو بہت اچھی بات ہوئی ہے۔"

" اب دیکھیں آگے آگے کیا ہوتا ہے ہماری فلمیں بھگوان نے چاہا تو دوزخ اور جنت دونوں جگہ ہٹ ہوں گی۔ اور سلور جوبلی منائیں گی۔ بلکہ ہم کوشش کریں گے۔ کہ ایکسپورٹ لائسنس لے کر زمین پر بھی انہیں ریلیز کر دیں۔"

" بھگوان ایکسپورٹ لائسنس دے دے گا۔؟"

" بھجن گا گا کر اس کو منا لیں گے۔ کیونکہ اس کو رشوت نہیں دی جا سکتی اس کی تعریف کی جا سکتی ہے۔"

ایک روز پچالکے صاحب اور گڈوانی صاحب لوکیشن کی تلاش میں جنت کا چکر لگا رہے تھے۔ کہ اچانک انہیں یوں محسوس ہوا جیسے جنت کے دروازے پہ جھگڑا ہو رہا ہے وہ لپک کر ادھر گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ گوپ مسخرہ جنت کے دربان سے جھگڑا کر رہا ہے۔

گوپ کہہ رہا ہے کہ میں جنت میں جانے کے لئے دنیا سے آیا ہوں اور دربان کہہ رہا ہے کہ وہ جنت میں نہیں جا سکتا۔

گوپ نے کہا۔

" کیوں۔؟"

دربان رجسٹر کھول کر بولا۔

" اس رجسٹر میں تمہارا نام درج نہیں ہے اور مجھے بھگوان سے

سیکریٹری کی طرف سے تمہارے بارے میں کوئی آرڈر ابھی تک نہیں ملا"
گوپ نے پیٹ پہ ہاتھ مار کر کہا۔
"اس پیٹ پہ رحم کرو بھائی.... میں دوزخ میں جا کر ایک ہی منٹ میں روسٹ ہو جاؤں گا۔"
دربان بولا۔
"میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ بھگوان کے سیکریٹری سے ملیے۔"
ادھر سامنے دوزخ کے فرشتے آگ میں جلتے ہوئے گرز لہرا لہرا کر گوپ کو اپنی طرف بلا رہے تھے۔ گوپ کا نپ رہا تھا اور اس کے سر کے بال کھڑے ہو گئے تھے۔ اتنے میں ایک ڈاکیہ آیا، اور دربان کو خط دے کر چلا گیا۔ دربان نے خط کھولا تو اس میں لکھا تھا۔ کہ مسٹر گوپ کو جنت میں داخل کرایا جائے۔
گوپ نے ایک قلابازی لگائی اور جنت کے دروازے میں سے گذر کر اندر آ گیا۔ اندر دونوں پہ ڈیوسروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور فوراً معاہدہ کر کے ایڈوانس دے دیا۔
اسی شام زمین سے شیطان کی ٹرنک کال آئی۔
"ہیلو۔ لاہور سے بول رہا ہوں۔ دو بڑے بے نظیر آرٹسٹ مزید آ رہے ہیں۔"
ایک کو میں نے کل تانگے میں سے گرایا ہے اور دوسرے کو شراب میں ڈبو ت چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ گھبراؤ نہیں چند دنوں کے اندر اندر وہ اوپر آ جائیں

گئے۔

چنانچہ وہی ہوا۔ ایک روز اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ پھولوں کے ہار گلے میں ڈالے چہرے پر مسکراہٹ لئے جنت والوں سے لطیفہ بازی کرتا انہیں ہنساتا ہوا مشہور آرٹسٹ ظریف چلا آ رہا ہے۔

پروڈیوسرں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اسکے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے اور اسے کندھوں پر بٹھا کر کمپنی کے دفتر میں لے آئے۔ اب ایک کیمرہ مین کی ضرورت تھی۔ پروڈیوسروں نے ممبئی میں شیطان کو ارجنٹ ٹیلی گرام دیا۔

"ایک کیمرہ مین۔ ارجنٹ پلیز۔"

دوسرے روز پرکاش کرملی نام کا ایک کیمرہ مین فلم کمپنی کے دفتر میں سر کو پکڑ کر بیٹھا ہوا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ اچانک کیسے ہو گیا۔؟

پروڈیوسروں نے اسے تسلی دی جنت کی خاص نہر کا پانی پلایا اور کہا۔

"ہم تمہیں اپنا چیف کیمرہ مین مانتے ہیں، آج سے تمہاری تنخواہ دو ہزار روپے ماہوار ہے۔"

ایک روز گردوانی صاحب جنت کے دروازے کے قریب ہی فلم کے ایک سیٹ کا معائنہ کر رہے تھے کہ اکیلا ایک انہیں آواز آئی۔

"اوے خیر ہووے سوہنیا!

اساں تاں ایس قابل نہیں ساں کہ ایتھے آ وندے۔ پر مولا دیاں رحمتاں نے۔ خیر ہووے مولا دی"

معلوم ہوا کہ چچا غلام محمد تشریف لا رہے ہیں۔ گردوانی صاحب نے ان

کا خیر مقدم کیا، اور انہیں سیٹ پر لے گئے۔
"ریلے یلے۔ ایمہ تے لنگ لگے ہوئے نیں۔ ساتوں تے ہیرو کے پُتر دا
پالرٹ دینا۔"
اب تو پروڈیوسر بہت گھبرائے کیونکہ آرٹسٹوں کا جمگھٹا لگ رہا تھا۔
اور اتنا فنانس نہیں تھا کہ ان کا خرچ اٹھایا جاتا۔ چنانچہ انہوں نے زمین پہ
شیطان کو ارجنٹ ٹرنک کال کی۔
شیطان نے پوچھا۔
"تم لوگ مجھے کیوں ڈسٹرب کر رہے ہیں۔ مجھے میرا کام کیوں نہیں کرنے
دیتے۔ اس وقت میں ایک ایکٹر کو بمبئی میں بیٹھا شراب پلا رہا ہوں۔"
پہلے صاحب نے کہا
"بکواس بند کرو اور فوراً اپنی کارروائیاں بند کر دو۔ ہمیں تمہاری بالکل
ضرورت نہیں۔ آج سے تمہیں نوکری سے الگ کیا جاتا ہے۔"
شیطان نے قہقہہ لگا کر کہا۔
"ہا ہا ہا! میں نے کام شروع کر دیا ہے۔ اب تم مجھے نہیں روک سکتے۔
میری سرگرمیوں میں صرف ایک صورت سے رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔
.... کہ ایکٹر
عقل سے کام لینا شروع کر دیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ کام کرنا، لالچ
کرنا، شراب پینا اور اسی قسم کی دوسری برائیوں سے توبہ کر لیں۔ اور چونکہ
بہت کم ایسا کر سکتے ہیں۔ اس لئے بہت کم زمین پر رہتے ہیں۔ اور میرا کام

زور شور سے چل رہا ہے۔"

"بھگوان تجھے غارت کرے شیطان۔!"

شیطان نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا، اور فون بند کر دیا۔

جنت میں اب سورگ فلم کمپنی کی پہلی فلم کی شوٹنگ شروع ہو گئی۔ دوزخ سے اب ڈانسر بھی بھاگ کر وہاں آ گئی تھی۔ اور فلم کی ایک ڈانس پیش کر رہی تھی۔ اتفاق سے ایک دن آؤٹ ڈور شوٹنگ ایسی جگہ پہ ہو رہی تھی جہاں سے دوزخ کی دیوار قریب ہی تھی۔ چنانچہ دوزخ کی دیوار پہ دوزخی بیٹھ گئے اور انہوں نے ہوٹنگ شروع کر دی، وہ ایکٹرسوں پہ آوازے کستے اور سیٹیاں بجا بجا کر انہیں اپنی طرف بلاتے تھے۔ یہ لوگ دوزخ کے ایک حصے سے بگل اور ڈھول اٹھا لائے۔ اور انہوں نے وہ دھما چوکڑی مچائی کہ مجبوراً شوٹنگ پیک اپ کر دینی پڑی۔

خدا خدا کر کے فلم مکمل ہوئی اور سورگ اور دوزخ کے چھ سینماؤں میں بیک وقت ریلیز ہوئی فلم ہٹ گئی۔ اس نے سب جگہ سلور جوبلی بلکہ گولڈن جوبلی کی، فلم کمپنی نے اب دوسری فلم کی زور شور سے تیاری شروع کر دی۔ فلم ابھی نصف ہی مکمل ہوئی تھی کہ جنت کی وزارت داخلہ کی طرف سے انہیں فوری طور پہ فلم بندی کے کام کو ختم کر دینے اور کمپنی کے دفتر کو بند کر دینے کا آرڈر آ گیا۔ کیونکہ فلم کے ریلیز ہونے کے بعد دوزخ کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ دوزخی لوگوں نے بال بڑھا لیے تھے۔ تلوار مار کر مونچھیں رکھ لی تھیں، وہ دوزخ کے فرشتوں سے ڈائیلاگ بولنے لگے تھے۔

مثلاً جب دوزخ کے داروغہ نے ایک دوزخی کو اپنی دوزخی محبوبہ کی یاد میں آگ کے درخت کے نیچے کان پر ہاتھ رکھ کر بھینس کی آواز میں گانا گاتے سنا۔ اور اسے خاموش رہنے کو کہا، تو دوزخی بولا۔

" تم مجھے گانے بجانے سے روکنے والے کون ہو۔ کیونکہ گانا میرا پیشہ ہے۔ اور محبت میرا فرض ہے"

داروغہ نے ایک نعرہ دار ہنٹر مارا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر یہ گیت گانا شروع کر دیا۔

پیار کیا تو ڈرنا کیا
جب پیار کیا تو ڈرنا کیا
پیار کیا کوئی چوری نہیں کی
چھپ چھپ آہیں بھرنا کیا

داروغہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد فلم کمپنی کے دفتر پہ تالا پڑ گیا۔ آرٹسٹ بیکار ہو گئے سٹوڈیو اٹھا کر زمین پہ پھینک دیا گیا۔ اس کے گرنے سے ایک زبردست دھماکہ ہوا، اور اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ مغل اعظم فلم کا پلاٹ میرے سینے پر دھرا تھا، اور سگریٹ جو نیند آجانے کی وجہ سے دری پہ گر پڑا تھا۔ دری کو ایک جگہ سے جلا کر خاک کر چکا تھا۔

. . . .

بھگت کبیر لاہور میں

بنارس سے پیدل چل کر جب بھگت کبیر لاہور آئے کیپٹن واگہ باڈر پہ پہنچا تو ہندوستانی باڈر پولیس نے اسے روک لیا۔ کبیر جی بڑے حیران ہوئے۔ انہوں نے پوچھا۔

"آپ نے مجھے کیوں روک لیا بھائیو۔؟"

کسٹم کے افسر نے بتایا کہ چونکہ ان کے پاس پاسپورٹ نہیں ہے اس لئے وہ ہندوستان کی سرحد پار کر کے پاکستان نہیں جا سکتے۔

کبیر جی نے تعجب سے پوچھا۔

"پاسپورٹ کیا ہوتی ہے۔؟"

کسٹم افسر بولا۔

"اول تو یہ ہوتی نہیں بلکہ ہوتا ہے ویسے تو یہ گتے کی جلد والی ایک

معمولی کاپی ہوتی ہے۔ لیکن اس کی مدد سے آپ کراچی۔ پشاور۔ لاہور۔ بمبئی۔ کلکتہ کی سیر کر سکتے ہیں۔ اگر وہ کاپی نہیں، تو آپ یہاں سے ایک قدم نہیں اُٹھا سکتے۔

کبیر جی بولے۔

"ہری اوم! میرے بھائی یہ کل جگ ہے۔ میں تو بنارس سے اپنے گورو جی کے درشن کرنے کے بعد لاہور میں گیان دھیان اور پریم محبت کی تبلیغ کرنے پیدل چل کر آ رہا ہوں! میں کیا جانوں پاسپورٹ کیا ہوتا ہے؟"

"ٹھیک ہے مسٹر کبیر! مگر ہم مجبور ہیں۔ آپ کے پاس پاسپورٹ ویزا نہیں تو براہِ کرم واپس بنارس تشریف لے جائیے؟"

بھگت کبیر بڑے دل برداشتہ ہوئے اور قریب تھا کہ وہیں سڑک پہ کھڑے کھڑے رونا شروع کر دیں کہ ایک سپاہی نے جلدی سے اُنکے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"کبیر صاحب! آپ نے پہلے ہی رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا ہے۔ اب خدا را رحم کیجئے اور یہاں رو دیجئے نہیں۔"

اتفاق سے وہیں ایک سمگلر بھی کھڑا تھا۔ اس نے کبیر جی کے پاؤں چُھو لیئے، اور بولا۔

"گورو جی! آپ مہان پُرش ہیں۔ اس خاکسار کو بھی خدمت کا موقع دیجئے۔ آج رات میرے غریب خانے پر رہیئے اور کل صبح آپ کے پاسپورٹ کا

بندوبست ہو جائے گا۔"

کبیر جی اس کی میٹھی میٹھی باتوں میں آ گئے اور اس کے ساتھ ہی اس کے گھر چلے گئے۔ رات کو اس سمگلر نے کبیر جی کی بڑی خدمت کی۔ کبیر جی ساری رات جاگ کر گھڑے پر اپنے دوہے گاتے رہے اور نہ خود سوئے اور نہ سمگلر کو سونے دیا۔

دوسرے دن سمگلر نے انہیں قائل کر لیا کہ وہ کسٹم چوکی سے چار میل کے فاصلہ پر جا کر سرحد پار کر جائیں۔ وہاں انہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ اس کے ساتھ ہی سمگلر نے ایک پوٹلی کبیر جی کو پکڑا دی۔ کبیر جی نے پوچھا۔

"اس میں کیا ہے بھائی۔؟"

"کچھ نہیں، خدا ایک ضروری چیزیں ہیں، آپ اسے باڈر پار آلو کملاں نامی گاؤں میں کریم بخش دھوبی کو دے دیں۔

بھگت کبیر وہاں سے پیدل ہی سرحد پار کرنے چل پڑے اتفاق سے جب وہ سرحد پار کرنے لگے تو اس وقت وہاں کوئی پہریدار نہیں تھا۔ وہ بڑی آسانی سے سرحد پار کر گئے۔ کریم بخش کو پوٹلی دے کر کبیر جی لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔ لاہور پہنچ کر انہوں نے راوی روڈ کے پاس ایک بجلی کے زور سے چلنے والی آٹا پیسنے کی چکی دیکھی تو کھڑے ہو کر وہیں زور زور سے پڑھنے لگے۔

چلتی چکی دیکھ کر دیا کبیرا روئے
دو پاٹن کے بیچ میں باقی بچا نہ کوئے

چکی کے مالک نے ایک فقیر ٹائپ کے آدمی کو دکان کے باہر روتا دیکھا تو پوچھا۔

" تم کیوں روئے ہو بابا۔ ؟ "

کبیر جی بولے۔

" چلتی چکی دیکھ کر رو رہا ہوں ۔ "

مالک بولا۔

" کیوں صبح صبح ہمارے کاروبار کو بددعائیں دے رہے ہو۔ جاؤ جاؤ اپنا راستہ لو۔ "

کبیر جی وہاں سے شہر کے اندر آ گئے۔

بھائی دروازے کے باہر کبیر جی نے چند ایک پہلوانوں کو اکھاڑے میں کشتی لڑتے دیکھا تو رو پڑے اور بولے۔

" بھائیو! اس تن کی پرورش کیوں کرتے ہو یہ تو فانی ہے۔ اپنی روح کی ورزش کرو۔ "

ایک پہلوان نے قریب آ کر پوچھا۔

" روح کی ورزش کیا ہوتی ہے۔ ؟ "

کبیر جی نے آنسو پونچھ کر کہا۔

" روزانہ اٹھ کر سر کے بل کھڑے ہو جایا کرو۔ پھر پالتی مار کر بیٹھ جاؤ، اور اپنے رب کا دھیان کرو۔ بھوک لگے تو ایک چاول کا دانہ کھاؤ۔ پیاس لگے تو پانی کا صرف آدھا گھونٹ پیو۔ "

پہلوان نے پیر جی کے سر پہ دھپ لگا کر کہا۔
"تے ونگل تیرا پیو کرے گا؟ جا اودے چھٹیاں کھا؟"
کبیر جی نے رو کر کہا۔
"میں نے میٹھا کھانا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو میں صرف چھولے کھاتا ہوں۔"
اتنا کہا افسلا دتے ہوئے وہاں سے آگے کو روانہ ہوگئے۔ انارکلی بازار میں جب انہوں نے رنگ برنگ کی چست لباسوں والی سیم تن لڑکیوں کو دیکھا تو حیران ہو کر وہیں کھڑے ہو گئے اور انگلی اٹھا کر بولے۔
پانی بھریں پنہاریاں رنگ برنگے گھڑے
بھریا اس کا جانیو جس کا توڑ چڑھے
ایک کالج گرل نے پرس میں سے دونی نکال کر بھگت کبیر کی ہتھیلی پہ رکھ دی۔
"یہ لو بابا جا کر روٹی کھا لینا۔"
"روٹی۔؟"
کبیر جی نے ایک آہ بھری روئے اور بولے۔
"تونے رات گنوائی سوئے کے
عمر گنوائی کھاتے کے......"
ایک لڑکی نے چہک کر کہا۔
"یہ کس فلم کا گانا ہے۔؟
یہ کس فلم کا گانا ہے۔؟"

دوسری بولی۔

" یہ تو مکیش نے گایا ہے۔"

تیسری بولی۔

" یا بارات کو سوئیں نہ تو اور کیا کریں۔؟"

کبیر جی نے کہا۔

" بھگوان کی بھگتی کر رہی بی۔"

ایک عینک پوش لڑکی آگے بڑھ کر بولی۔

" مائی گاڈ! تم مشہور شاعر بھگت کبیر ہو۔"

تم وندرفل ہو۔ تم نے دوہرو کر ساری تاریخ کے اوراق پھاڑ دیئے ہیں۔

تم یہاں کیا کرنے آئے ہو۔؟"

کبیر نے شرما کر کہا۔

" بھگوان کی لیلا دیکھنے۔"

ایک لڑکی بولی۔

" لیلیٰ مجنوں دیکھنے کیا۔؟"

ساری لڑکیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ ایک خوبصورت لڑکی جس کی طرف بھگت کبیر چوری چوری آنکھوں سے دیکھ رہے تھے شرما کر بولی۔

" تم کتنے اچھے ہو کبیر! مگر تمہارا نام بڑا بور ہے تم بڑے بور شاعر ہو اچھا بتاؤ تمہیں لتا پسند ہے یا آشا، تم نے فلم برسات کی رات دیکھی ہے؟

قریب تھا کہ بھگت کبیر پھر رو پڑیں کہ سب لڑکیوں نے اپنے

رومال نکال لیے اور کبیر جی کی آنکھوں پر رکھ دیے۔ رومالوں کی خوشبو سے کبیر جی کا دماغ معطر ہو گیا، اور وہ خوش ہو کر بولے۔

"کاش میں ساری زندگی ایسے ہی گذار دوں۔"

اتنے میں وہاں ایک سپاہی آ گیا اور اس نے مجمع منتشر کر دیا۔

یہاں سے کبیر جی کافی ہاؤس میں آ گئے۔ یہاں ان کی ملاقات دوسرے شاعروں اور ادیبوں سے ہوئی۔ ایک موٹا شاعر آنکھیں بند کر کے چہرے پر زبردستی کا درد پیدا کر کے رونے کی کوشش کرتے ہوئے ایک دوہا پڑھنے لگا۔

کبیر جی نے زندگی میں پہلی بار مسکرا کر پوچھا۔

"بھائی تمہیں کیا تکلیف ہے۔"

شاعر بھونچکا ہو گیا۔

"تکلیف کیا معنی۔؟"

"مطلب یہ کہ تم شعر کیوں لکھتے ہو، تم پہلوانی کیوں نہیں کرتے۔ تمہاری شکل لوہاروں ایسی ہے اور جب تم گا کر سناتے ہو تو معلوم ہوتا ہے خراد کا کارخانہ چل رہا ہے۔"

موٹا شاعر بھگت کبیر کو گالیاں سنانے لگا۔

کبیر جی گالیاں بڑے انہماک سے سنتے رہے، اور پھر کافی کا ایک پیالہ طلب کیا انہیں سگریٹ دیا گیا۔ سگریٹ لے کر انہوں نے سلگایا، اور پیتے پیتے پھر لدھڑ سے بسگریٹ بجھایا اور روتے ہوئے بولے۔

جلتا سگریٹ دیکھ کر دیا کبیرا رو
اِس کاغذ کے بیچ میں ثابت رہا نہ کو

ایک آرٹسٹ نے پوچھا۔

" کبیر صاحب وہ آپ کا دوہا ہے نا کہ
نہ کا ہو سے دوستی نہ کا ہو سے بیر
بائی دی وے یہ مسٹر کا ہو کون تھا ؟ "

بھاگت کبیر نے چیخ ماری اور کافی ہاؤس سے باہر آ گئے۔ باہر آ کر وہ ایک بس کے نیچے آتے آتے بچے۔ ایک آدمی نے جس کا حُلیہ درویشوں ایسا تھا اُسے بچا لیا۔ کبیر جی نے اس کا شکریہ اُدا کیا۔ اس درویش نے پوچھا۔

" بابا جی آپ کہاں سے آئے ہیں۔ ؟ "

کبیر جی نے رو کر کہا۔

" بنارس سے۔ "

درویش بولا۔

" آپ کیا کرتے ہیں۔ ؟ "

" روتا ہوں گاتا ہوں۔ راتوں کو جاگتا ہوں۔ "

درویش نے ہاتھ ملا کر کہا۔

" بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ خاکسار کا بھی یہی کام ہے میرا نام وحشت لاہوری ہے۔ خاکسار شاعر ہے۔ اور ایک ہزار کے قریب غزلیں لکھ کر لوگوں کے سروں پہ مار چکا ہوں "

یہ آدمی کبیر جی کو ایک خفیہ جگہ لے گیا۔ جہاں جا کر اس نے کبیر جی کو زبردستی بھنگ پلا دی۔ بھنگ پی کر بھگت کبیر کو ایک ایک کے دو دو دکھائی دینے لگے۔ اُن کا دماغ چکرانے لگا۔ انہوں نے بازار میں آ کر ناچنا شروع کر دیا۔
ایک سپاہی نے انہیں پکڑ کر ہلایا، اور کہا۔

"بازار میں تو مستی مت کرو بابا"

کبیر نے ایک ٹانگ پر رقص کرتے ہوئے کہا۔

"مستی مستی مت کرو مستی کبھی نہ ہووے!
مستی ڈھونڈت جگ ہوا مستی ملے نہ کوے"

سپاہی نے انہیں ایک دھپ لگائی اور چلتا کیا۔ بھنگ کے نشے میں چور ہو کر کبیر جی ساری شام لاہور کی سڑکوں پر گھومتے رہے اور چوک میں کھڑے ہو کر روتے اور دوہے گانے رہے اور لوگوں کو پریشان کرتے رہے۔
جب رات آئی تو بھگت کبیر نے خوشی کا نعرہ بلند کیا، وہ خوش ہوئے اب ساری رات سڑکوں پر پھریں گے۔ جاگ کر بھگتی کریں گے اور قدرت کی جولانیوں سے لطف اٹھائیں گے۔ رات کا ایک بجا ہوگا کہ بھگت کبیر میکلوڈ روڈ کے چوک میں ایک طرف بلڈنگ کے پاس کھڑے آسمان پر کھلے ہوئے ستاروں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کہ ایک کانسٹیبل نے قریب آ کر گردن دبوچ لی۔

"کیوں بے کیا کر رہا ہے۔؟"

کبیر جی بولے۔

"ستاروں کا لطف اٹھا رہا ہوں"

"کیا اٹھا رہے ہو۔؟"

"لطف! مزہ۔ لائیو۔ ستارے۔ بھگوان کی لیلا ہیں۔"

سپاہی نے کہا۔

"ستارے دیکھ رہے ہو کہ چوری کرنے کے لئے مکان کی کھڑکی تاک رہے ہو۔"

کبیر جی بولے۔

چوری چوری مت کہو۔ چوری چوری ہوئے

سپاہی نے چپت لگا کر پوچھا۔

"کیوں بے تمہارا نام کیا ہے۔؟"

"بھگت کبیر۔"

"تم ہندو ہو۔"

"نہ ہندو۔ نہ مسلمان۔ نہ سکھ۔ نہ عیسائی۔"

"تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے۔؟"

"بھگوان کے پاس۔"

"ویزا کہاں ہے۔؟"

"بھگوان کے پاس۔"

"تم کہاں رہتے ہو۔؟"

"بھگوان کے پاس۔"

"تو پھر میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں۔؟"

"بھگوان کے پاس۔"

اور سپاہی نے بھگت کبیر کو تھانے لے جا کر ان کا چالان کیا اور حوالات میں بند کر دیا دوسرے روز انہیں عدالت میں پیش کیا گیا جہاں سے انہیں غیر قانونی طور پہ پاکستان کی سرحد عبور کرنے کے جرم میں چھ ماہ کی سزا سنائی گئی۔

چھ ماہ کی سزا کاٹ کر کبیر جی رشتے ہوئے جیل سے نکلے اور ہندوستان کی سرحد عبور کر گئے۔ ہندوستان کی سرحد پر انہیں غیر قانونی طور پہ سرحد عبور کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہاں بھی ان پر مقدمہ چلایا گیا اور وہاں بھی انہیں چھ ماہ کی سزا ہو گئی۔ چھ ماہ مزید جیل خانے میں گذار کر جب بھگت کبیر باہر نکلے تو انکی طبیعت صاف ہو گئی تھی۔ دوہے سب بھول چکے تھے اور رونا چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے دلی کے ایک سینما گھر میں گیٹ کیپری اختیار کر لی۔ آجکل بھی وہ گیٹ کیپر ہیں۔ رش والی فلم لگی ہو تو خوب بلیک کرتے ہیں۔ بھگوان کی بھگتی بھی کرتے ہیں۔ بلیک کی ٹکٹیں بھی فروخت کرتے ہیں۔ بچے بھی پیدا کرتے ہیں، اور تھوڑی بہت اسمگلنگ بھی کر لیتے ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھی ان پر رشتے کا دورہ پڑتا ہے۔ وہ سینما کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا کر کہتے ہیں:

چلتا سنیما دیکھ کر دیا کبیرا رو
اس فلموں کے پھیر میں باقی بچا نہ کو

اور دھڑا دھڑ رونا شروع کر دیتے ہیں۔

. . . .

جن کی واپسی

ایک روز ایک ماہی گیر دریا پر مچھلیاں پکڑ رہا تھا کہ اسے جال بہت بھاری محسوس ہوا۔ ماہی گیر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ بہت سا مال ہاتھ لگا ہے۔ وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ جال کو باہر کھینچنے لگا۔ اتنے میں بارش شروع ہو گئی اور بادل زور زور سے گرجنے لگے۔ ماہی گیر نے ہمّت نہ ہاری اور برابر جال کھینچنے میں مصروف رہا۔ جب اس نے جال پانی سے باہر نکالا تو یہ دیکھ کر اس کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا کہ جال میں مچھلی تو ایک بھی نہیں، البتہ ایک بہت بڑی لوہے کی دیگ ضرور موجود ہے۔ وہ کنارے پر ہانپتا ہوا بیٹھ گیا اور لگا اپنی قسمت کو رونے کیونکہ اس روز اسے ایک بھی مچھلی ہاتھ نہیں لگی تھی اور وہ صبح سے بھوکا تھا۔ پھر اس نے سوچا۔ لاؤ اس دیگ کو ہی کھول کر دیکھیں۔ شاید قارون کی دولت چھپی ہوئی ہو اور قسمت بدل جائے۔

اس خیال کے ساتھ ہی اس نے دیگ کو جال میں سے باہر نکالا۔ اور لوہے کے لٹھ سے دیگ کا ڈھکنا کھولنے لگا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد ڈھکنا تڑاق سے کھُل گیا۔ ڈھکنے کے کھلتے ہی اس میں سے دھواں نکلنا شروع ہو گیا۔ بادل زور زور سے گرجا، بجلی چمکی، بے حد شور مچ گیا۔ اور ایک بہت بڑا جن ماہی گیر کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ماہی گیر ڈر کر ایک طرف دبک گیا تھا جن دیگ میں سے نکلنے کے بعد انگڑائیاں لے رہا تھا اور جیب میں سے کنگھی نکال کر اپنی زلفوں کو بنا سنوار رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی ٹائی کی ناٹ درست کی اور بولا۔

" اے ماہی گیر! تم نے مجھے اس قید سے آزاد کیا ہے میں ہزاروں برس سے اس قید میں تھا۔ بتا اس کے عوض کیا چاہتا ہے۔ میں آج سے تیرا غلام ہوں "

ماہی گیر نے جب جن کی زبان سے دوستی کی باتیں سنیں تو اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ وہ آگے بڑھ کر بولا۔

" میرے لئے ایک عالی شان محل بنا دو، جس میں ساری عمر کے لئے کھانے پینے کی چیزیں موجود ہوں۔ "

جن نے بھرپور قہقہہ لگایا اور بولا۔

" جب تم واپس اپنے گھر جاؤ گے تو محل کو تیار کھڑا پاؤ گے۔ لیکن اب مجھے بھی ایک بات بتا دو۔

ماہی گیر نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"فرمائیے۔"
جن نے مسکرا کر کہا۔

"سنا ہے اس شہر میں فلمیں بنتی ہیں۔ اور چوک لکشمی بھی ہے۔ در اصل میں شاعر ہوں اور فلموں میں گیت لکھنا چاہتا ہوں مجھے بتاؤ۔ یہ چوک لکشمی کہاں ہے۔؟"

ماہی گیر نے جن کو چوک لکشمی کا پورا پتہ بتایا اور خود جال کندھے پہ ڈال کر خوشی خوشی گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جن نے بھی اپنے کپڑے ٹھیک ٹھاک کئے اور چوک لکشمی کی طرف روانہ ہو گیا۔ چوک لکشمی میں پہنچ کر اس نے تصور کی دکان پہ سے بنارس کا قوام والا پان کھایا اور محسوس کیا کہ اسکی قوت متصورہ تمازت ہو رہی ہے اور حافظہ کند ہونا شروع ہو گیا ہے۔ یہاں اسکی ملاقات ایک فلمی کہانی نویس سے ہو گئی۔ جو ایک کھمبے کے نیچے کھڑا جم خانہ شراب کے ایک کوارٹر کے پیسے لینے کے لئے اپنے پروڈیوسر کا انتظار کر رہا تھا جن نے اپنا تعارف کروایا۔

"اس خاکسار کو سرور تونسوی کہتے ہیں۔ فلمی شاعری کا شوق ہے اور ایک صد گیت زبانی یاد ہیں۔ کیا کسی فلم میں گیت لکھنے کا چانس مل جائے گا۔ ویسے خاکسار جن بھی ہے۔"

آخری جملہ سنکر کہانی نویس کی روح ہوا ہو گئی۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"سرور تونسوی صاحب اگر آپ جن ہیں تو آپ کو شاعر بننے کی کیا

ضرورت ہے۔ ؟"

جن نے گرم ہو کر کہا۔

"کیوں کیا ہم جن لوگوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا ؟ کیا ہمارا جی خوبصورت عورتوں کو دیکھ کر شعر کہنے کو نہیں چاہتا۔ ؟"

کہانی نویس خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنے پروڈیوسر سے جن کا تعارف کروایا۔ اور جن کو فلم میں گیت لکھنے کا کام مل گیا۔

دوسرے روز جن فلم کمپنی کے دفتر میں آن حاضر ہوا۔ وہاں ڈائرکٹر اور کچھ دوسرے لوگ بھی بیٹھے تھے۔ ڈائرکٹر نے جن کو ایک سچوایشن بتائی۔

"سرور صاحب موقع یہ ہے کہ ہیرو بے گناہ حوالات میں بند ہے۔ ولین شراب کی بوتل ہاتھ میں لئے ہیروئن کے کمرے میں داخل ہوتا ہے اور اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ ہیروئن اس وقت گانا گاتی ہے۔ ولین نے اسے دھکا دے کر زمین پر گرا رکھا ہے اور وہ زمین پر پڑے پڑے گانا گا رہی ہے۔ اب آپ اس گانے کو اندر جا کر لکھیئے۔"

جن نے آمنّا صدقنا کہا۔ سگریٹ، چائے، قوام والا پان منگوایا اور کمرے میں بیٹھ کر گیت لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کافی دیر پیچ و تاب کھانے، قلابازیاں کھانے، دیواروں سے سر ٹکرانے کے بعد اس نے گیت کا مکھڑا لکھا اور باہر آکر ڈائرکٹر کو سنایا۔

؎ چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

ڈائرکٹر، پروڈیوسر اور دوسرے لوگ دم بخود ہو کر رہ گئے۔

انہوں نے کہا۔

"یہ تو فارسی زبان ہے۔ یہ تو جناتی زبان ہے۔"

جن نے سر کھجا کر کہا۔

"میں ایران کا جن ہوں۔"

ڈائریکٹر نے چیخ کر کہا۔

"تو گدھا ہے۔ ایرانی گدھا ہے۔ اگر فلمی شاعری کرنی ہے تو تجھے سیدھے راستے پر آنا ہوگا۔"

اس کے ساتھ ہی انہوں نے ڈنڈا پکڑا اور دھڑا دھڑ جن کی مرمت کرنی شروع کر دی۔ جن نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ پھر ان لوگوں نے جن کو الٹا لٹکا کر اس کے نتھنوں میں سرخ مرچوں کی دھونی دینا شروع کر دی۔ جن کو تو نانی یاد آ گئی۔ دیگ میں دو ہزار برس تک قید رہنے کے باوجود اس نے ایسا خوفناک عذاب کبھی نہ سہا تھا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"رحم! رحم!! میں حضور کا غلام ہوں۔ آئندہ سے فارسی میں شعر نہیں کہوں گا۔"

اس کے بعد جن ایک بار پھر کاغذ پنسل لے کر بیٹھ گیا۔ اب ڈائریکٹر نے اسے رم خانہ کا ایک پورا کوارٹر پلا دیا۔ جن نشے میں جھوم جھوم کر گیت بھی لکھتا رہا اور ساتھ ساتھ گاتا بھی رہا۔ اب اس نے یہ گیت لکھا۔

نہ بنا تیر ہوس کا نشانہ مجھے

کیا ہو گیا ہے ظالم زمانہ تجھے

کل کو لوگ کہیں گے دیوانہ تجھے
سُنا کوئی عشق کا افسانہ مجھے

ڈائریکٹر اور اس کے ساتھی پھڑک اُٹھے۔ انہوں نے فوراً جن کو ملازم رکھ لیا۔ اس نے فلم کے گیت لکھنا شروع کر دیئے۔ لیکن اب آہستہ آہستہ اس فلمی گیت نویسی کا کام چھوڑ کر کمپنی والوں نے دوسرا کام لینا شروع کر دیا۔ یعنی وہ جن کو مجبور کرتے کہ وہ فلاں ایکٹریس کو اٹھا لائے۔ فلاں بنک سے اتنے ہزار روپیہ نکال لائے۔ فلاں شراب کی دکان سے شراب کی اتنی بوتلیں لے آئے۔ جن اگر انکار کرتا تو اُسے ڈنڈوں سے مارا پیٹا جاتا، اور ناک میں سُرخ مرچوں کی دھونی دی جاتی، وہ بار بار کہتا۔

"میں شریف ایرانی جن ہوں، میں نے کبھی شراب نہیں پی کبھی کسی عورت کو ناجائز تنگ نہیں کیا۔ کبھی چوری نہیں کی۔ میں تو شریف شاعر جن ہوں۔ فلمی گیت لکھنے کے شوق میں یہاں آ گیا ہوں۔ مجھ پر کرم کیا جائے۔"

لیکن ڈائریکٹر صاحب ڈنڈا اس کی پیٹھ پر مار کر کہتے۔

"بند تیرے جن کی ایسی تیسی ذرا ٹھہر تو سہی۔ تیرا باپ بھی یہ کام کرے گا۔"

جن مجبور تھا کیونکہ ڈائریکٹر نے اس کی ایک انگوٹھی اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ وہ مجبور ہو کر اس کا ہر حکم بجا لاتا۔ ایک بار وہ ایک مشہور ایکٹریس کو اٹھا لایا۔ ایکٹریس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور پوچھا۔

"میں کہاں ہوں۔؟"

"ہماری آغوش میں جانِ جاں۔"

"یہاں کیسے آگئی۔ ؟"

ڈائریکٹر نے ڈنڈا لہرا کر کہا۔

"اس جادوئی ڈنڈے کے زور سے"

"مجھے فوراً اسٹوڈیو واپس بھجوائیے نہیں تو پولیس کو خبر کر دوں گی"

ڈائریکٹر نے کہا۔

"میرے قبضے میں جن ہے۔ اگر ذرا چوں چراں کی تو سارے خاندان کا صفایا کروا دوں گا۔"

آہستہ آہستہ ساری فلم انڈسٹری میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ فلاں فلم ڈائریکٹر کے قبضے میں جن ہے۔ اس کی فلمیں تیزی سے بننا شروع ہو گئیں شہر کے بنکوں میں سے روپیہ اچانک غائب ہونا شروع ہو گیا۔ شراب کی دکان سے دیکھتے دیکھتے بوتلوں کی پوری قطار غائب ہو جاتی۔ لوگوں نے پولیس کو اطلاع کر دی تفتیش شروع ہوئی۔ فلم ڈائریکٹر گرفتار کر لیا گیا صبح گرفتار ہوا شام کو جن اُسے اٹھا کر واپس اس کے گھر پہنچا دیتا۔ فلم ڈائریکٹر نے شہر والوں، اور غریب شاعر جن کا ناک میں دم کر دیا۔ اسے فلمی شاعری کا شوق تھا۔ بے چارہ فرصت کے اوقات میں تو ام والا پان کھا کر فکر سخن کیا کرتا۔ مکھڑے پہ مکھڑا لکھ کر ڈائریکٹر کو دکھاتا، اور داد طلب کرتا۔ مگر بجائے داد دینے کے ڈائریکٹر اس کی پیٹھ پر زور سے ڈنڈا مار کر کہتا۔

"حرامزادے! تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ! کے آدمی ارے پیر شدی؟ خبردار جو آئندہ سے کبھی مکھڑا لکھنے کی

جرأت کی۔"

جن کی جان عذاب میں آگئی۔ نہ وہاں سے بھاگ سکتا تھا۔ نہ وہاں رہ سکتا تھا۔ کیا کرے۔ ؟ کہاں جائے؟ اس سے تو دیگ کی دو ہزار سالہ قید ہی اچھی تھی۔ اتنا طاقت ور جن جو پہاڑوں کو آن میں اُلٹ سکتا تھا اب ایک منحنی سے ڈائریکٹر کے قبضے میں انگوٹھی تھی۔ وہ آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر جن نے ایک ترکیب نکالی۔ اس نے ڈائریکٹر کی ایک محبوب ایکٹریس کے پاس جاکر رونا رویا، اُسے بتایا کہ وہ دراصل جن ہے اور اگر وہ کسی ترکیب سے اُسے انگوٹھی واپس لادے تو وہ اُسے مالا مال کر دے گا۔ اور ملک کی مشہور سپر ہیروئن بنادے گا۔ ایکٹریس مان گئی۔ اس نے ایک روز ڈائریکٹر کو شراب کے نشے میں غافل پاکر اس کی انگلی سے انگوٹھی اتارلی، اور فوراً سرور تونسوی عرف جن کو لاکر دے دی۔

جن نے انگوٹھی انگلی میں پہن کر ایکٹریس کا شکریہ ادا کیا اور ایک فلک شگاف نعرہ لگایا۔ اس نعرے سے سارا شہر لرز اٹھا۔

ڈائریکٹر بھی ہوش میں آگیا۔ اس نے آنکھیں مل کر پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

جن نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"اپنی موت کے سامنے نادان فلم انڈسٹری کے نادار چوہے تیری یہ مجال کہ ایک جن سے ٹکے ٹکے کا کام لیتا پھرے۔ اب اپنے انجام کیلئے تیار ہو جا۔"

اس کے ساتھ ہی جن نے ایک ایسا منتر پھونکا کہ اس کا آدھا دھڑ گدھے کا

ہو گیا۔ ڈائریکٹر چیخنے چلانے لگا۔ جن نے فضا میں ہنٹر لہرا کر کہا۔

"میں تیرے خاندان کا صفایا کر دوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اس زور سے ہنٹر کا وار کیا کہ جھٹکے سے انگوٹھی اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ انگوٹھی کا گرنا تھا کہ ڈائریکٹر فوراً اپنی اصلی حالت میں آ گیا۔ جن بھیگی بلّی بن کر کھڑے پر مکھڑا گانے لگا۔ اب ہنٹر ڈائریکٹر نے پکڑ لیا۔ جن نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی اور سڑک پر دریائے راوی کی طرف بے تحاشا بھاگ کھڑا ہوا۔ دریا پر جا کر اس نے ماہی گیر کو تلاش کیا۔ اور گڑگڑا کر بولا۔

"پیارے ماہی گیر خدا کے لئے مجھے اس دیگ میں پھر سے بند کر دے۔ میں اس فلمی شاعری سے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

جس وقت ماہی گیر جن کو دیگ میں بند کر کے دریا میں بہا چکا تھا تو ڈائریکٹر ہنٹر لہراتا وہیں آن موجود ہوا۔ مگر جن دیگ میں بند دریا کی لہروں پر بہا جا رہا تھا۔ ڈائریکٹر چابک لہرا کر اُسے آوازیں دے رہا تھا۔

"ٹھہر جا کمینے! اب بھاگ کر کہاں جا رہا ہے فلمی گیت کا مکھڑا نہیں لکھے گا کیا۔"

دیگ کے اندر جن کو آوازیں آ رہی تھیں جب فلمی گیت کے مکھڑے کے الفاظ اس کے کان میں پڑے تو وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اور اسے پسینے چھوٹ گئے۔

. . . .

دیہات کی بہاریں

لالیاں سے ایک کچی سڑک چک بھڑانہ کی طرف جاتی ہے۔ چونکہ یہ سڑک اپنی مرضی کے خلاف جاتی ہے اس لئے ہر قدم پر سفر کرنے والے کے راستے میں روڑے اٹکاتی ہے۔ سائیکل سوار کا ٹائر پنکچر کرتی ہے اور کوچوان کا ٹیڈ اُلٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس سڑک پر جو تانگے چلتے ہیں اُن کا سب کچھ ہلتا ہے۔ مگر گھوڑا اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ چنانچہ عام طور پر یہاں کوچوان، گھوڑے کی لگام تھامے سواریوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ دُنیا کی پہلی سڑک ہے۔ جس پر پہیوں کے آگے گھوڑے اور گھوڑوں کے آگے کوچوان جتے ہوتے ہیں۔

اپنے دوست ملک یار محمد کے گاؤں پہنچنے کے لئے مجھے اس سڑک پر سے گزرنا پڑا۔ اور یقین کیجئے ملک یار محمد کے ڈیرے پر پہنچ کر مجھے محسوس ہوا

کہ میں واقعی گزر چکا ہوں اور اب اللہ ہی اللہ ہے۔ ملک صاحب گاؤں کے اچھے خاصے زمیندار ہیں۔ اس سے پہلے بھی میں نے کئی بار ان کے ہر بلندا صرار پر گاؤں جانے کا ارادہ کیا۔ مگر حوصلہ نہ ہوا لیکن آخر ملک صاحب جیت گئے۔ اور مجھے ان کے گاؤں جانا ہی پڑا۔ لاہور سے لالیاں تک کا سفر خاصا دلچسپ رہا۔ لاہور سٹیشن پر قلی سے لڑائی ہوئی سانگلہ ہل سٹیشن پر ایک خوانچہ فروش آٹھ آنے کے آلو بخارے دے کر روپے میں سے باقی آٹھ آنے ہاتھ میں پکڑے پلیٹ فارم پر مجھے دیکھتا ہی رہا۔ اور گاڑی چل دی۔ میں کھڑکی میں سے اس کا منہ ہی تکتا رہ گیا۔ ہاں تو سفر خاصا دلچسپ رہا۔

لالیاں میں ملک صاحب موجود تھے۔ پروگرام یہ بنا کہ یہاں دوپہر کا ماحضر تناول فرما کر آرام کیا جائے اور پھر دوپہر ڈھلے اس بادل نخواستہ وقت کا سفر اختیار کیا جائے جب ذرا گرمی کم ہوئی تو ہم لوگ یکے میں سوار ہو گئے اور یکہ اس تاریخی سڑک پر چلنے لگا۔ تھوڑی دور تک چلنے کے بعد کوچوان رک گیا۔ گھوڑا بھی رک گیا۔ اور ساتھ ہی یکہ بھی رک گیا۔ کوچوان کہنے لگا۔

" ذرا گھر تک اطلاع کر آؤں کہ میں چپ چاپ جا رہا ہوں "

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ اپنی والدہ ماجدہ سے اپنا دودھ بخشوانے گیا تھا کیونکہ اس سڑک سے شاذ و نادر ہی کوئی کوچوان صحیح و سالم واپس پلٹتا ہے۔

اب ہمارا سفر شروع ہوتا ہے۔ جو کبھی کولمبس کو نئی دنیا دریافت کرتے ہوئے بھی پیش نہ آیا تھا۔ یکے کے آگے اور کوچوان کے پیچھے جو گھوڑا تھا وہ

اصلی گھوڑے کا ایکسرے تھا۔ اور مرزا سودا کے گھوڑے کی یاد تازہ کر دیا تھا
اس نے پہلا قدم اٹھایا تو ہمیں یوں لگا۔ جیسے ہم اونٹ پر سوار ہیں، اور
سفر موت پر رواں ہیں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ کوچوان گھوڑے کے گرد گھوم
رہا تھا۔ اور گھوڑا یکے کے گرد گھوم رہا تھا۔

جس وقت ہم گاؤں میں داخل ہوئے شام ہو چکی تھی اور اعضاء پہ
تھکن اور پژمردگی طاری تھی۔ جیسے ہو نولولو سے پاؤں پیدل چل کر موضع
بھرانہ آرہے ہوں۔ ہمارے آنے کی اطلاع کر دی گئی تھی۔ سڑک سے ہٹ
کر درختوں کے جھنڈ تلے ایک جگہ لالٹین جلائے ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔ ایک
چھوٹی سی پیاری بچی نے لالٹین اٹھائے گاؤں کی تنگ اور کچی گلیوں میں
گھر تک ہماری رہنمائی کی۔ ملک صاحب نے ہمارا سامان وغیرہ اتروا کر
ساتھ لیا اور ہم ایک حویلی نما دروازے کے اندر داخل ہوئے۔

سفر کی تکان سے دل و دماغ اس قدر نڈھال ہو رہے تھے کہ کچھ
سجھائی نہ دے رہا تھا۔ صرف اس قدر احساس ہوا کہ مکان کشادہ ہے
اور تینوں جانب لمبے لمبے ستونوں والے برآمدے ہیں۔ اس کے بعد فوراً چھت
پر چار پائیاں بچھا کر بکھونے لگا دیئے گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور قیامت
خیز سفر کی تکان بستر پہ گرتے ہی بیہوش ہو گیا اور رات بھر خواب دیکھنے کی
بھی فرصت نہ ملی۔

سویرے جو آنکھ کھلی تو سامنے نیم کا بڑا پیڑ نظر آیا جس کی شاخیں
میٹھی میٹھی خوشگوار ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ سب سے پہلی آواز جو کان میں پڑی،

وہ دودھ بلونے لگی تھی۔
گرڑ گرڑ۔ گرڑ۔

میں بستر پہ بیٹھ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک لمبی چھت ہے میرے پاس ہی تخت پوش پر مٹی کا گھڑا کانسی کا گلاس اور بجھی ہوئی لالٹین رکھی ہے بڑن نکل آیا۔ اور ارد گرد کے کچے مکانوں کے درمیان کہیں کہیں شہتوت، نیم اور ٹاہلی کے درخت صبح کی ہوا میں جھوم رہے ہیں۔ کچے مکانوں کی چھتیں، اور سیڑھیاں بڑی صفائی کے ساتھ پوتی گئی ہیں۔ کہیں عورتیں اور بچے ننگی..... چارپائیوں پر ابھی تک سو رہے ہیں۔ ساتھ والی دیوار کے نیچے ایک عورت "روکی" دیوار کے ساتھ لگائے چاٹی میں سے مکھن نکال کر کوزے میں ڈال رہی ہے۔ پاس ہی ایک جوان لڑکی میلا سا کرتا اور سیاہ دھوتی پہنے اپنے ننگے بچے کو سینے سے لگائے چارپائی پر سو رہی ہے۔ ایک کسان کیکر کے درخت تلے منہ دھو رہا ہے۔ ایک مکان میں ایک عورت نے چارپائی سر پہ اٹھائی بچے کو بغل میں دبایا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔ یہ مکان اس قدر پرانی طرز کے بنے ہوئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ موہنجوداڑو سے بھی پہلے کے ہیں۔

ملک صاحب کا مکان بہت بڑا تھا اور حویلی نما تھا۔ یہاں کسی چیز کی فراغت نہ تھی۔ ملک صاحب کے چھوٹے بھائی سے جو زمینداری کرتے تھے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنے یار سائیں لودے شاہ سے ملایا۔ لودے شاہ گوندلوں کا پیر تھا اور بھنگ کا رسیا جو ہیں گھنٹے بھنگ کے نشے میں ڈوبا رہتا۔

تعارف سے پہلے آپ کھیتوں میں گھوم پھر کر بینگن کی بوٹی توڑ رہا تھا۔ شوکھا سا چہرہ گلے میں سبز منکوں کی مالا، لمبا قد، کھرکھری آواز۔

ہم لوگ جامن کے درختوں کی چھاؤں میں مونڈھوں پر بیٹھ گئے اتنے میں ایک کسان آیا، ادھیڑ عمر کا کمزور جسم، کالا ہتمند، پھٹی ہوئی جوتی۔ آکر سلام کیا۔ اور زمین پر بیٹھ کر ملک صاحب کو دیکھ کر احمقوں کی طرح ہنس پڑا۔ ملک صاحب نے کہا۔

" پھر کچھ لینا ہے تمہیں احمو؟ "

احمو ہنستا گیا۔ پھر بولا۔

" ملک جی! بات یہ ہے۔ مجھے اعظم گوندل کے پیسے دینے ہیں۔ اعظم گوندل کو جھکی کمہار کے دینے ہیں، اور جھکی کمہار کو سلونائی کے دینے ہیں، سلونائی جھکی کمہار کو تنگ کرتا ہے۔ جھکی کمہار اعظم کو اور اعظم گوندل مجھے تنگ کرتا ہے۔ آج اُس نے میرا بل بھی چھین لیا۔"

پتہ چلا کہ معاملہ صرف سوا تین روپوں کا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا تھا کہ جتنے پیسوں میں ہم رنگیل سینما میں فلم دیکھ کر بڑے مزے سے دنیا بھول جاتے ہیں اُتنے پیسوں میں چک پھڑانہ میں جتتے ہوئے ہل رک جاتے ہیں اور اعظم گوندل احمو کو کھیتوں سے باہر نکال دیتا ہے۔

یہاں سے اٹھ کر ہم لوگ حویلی میں آگئے۔ ناشتے پر خالص اور تازہ مکھن اور خالص گھی میں تلے ہوئے پراٹھے تھے۔ ملک صاحب نے یہ تازہ ولا جتنے پراٹھے سامنے بیٹھ کر کھلائے۔ اس کے بعد ہم سو نے

کے لئے چارپائی تلاش کرنے لگا۔ آخر ایک جگہ چارپائی مل گئی اور میں درختوں تلے جا کر لیٹ گیا۔

شام کو گاؤں کی سیر کو نکلے۔ پاس ہی ایک بہت بڑا گندہ تالاب تھا۔ جس کی بدبو سارے گاؤں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس گاؤں کی تنگ اور گندی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے میں نے ایک جگہ تو بہت عورتوں کا ہجوم دیکھا۔ کچھ آٹا گوندھ رہی تھیں اور کچھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

موضع ماموں کی کھٹی اور بکرانہ کے درمیان ایک آموں کا باغ ہے یہاں آم کے درختوں کے نیچے چھوٹی سی کھٹولی پر رکھوالا لڑکا سو رہا تھا۔ اس کی گویا زمین پر گری پڑی تھی اور منہ پر پسینہ آیا ہوا تھا۔ اوپر درختوں میں کچے کچے اچاری آم لٹک رہے تھے۔ اب شام گہری ہو گئی اور سامنے گول گول چاند نکل آیا۔ گاؤں کا اداس اور زرد چاند نکل آیا اور اسکے ساتھ ہی ہوا بھی چل نکلی اور آنگن والے نیم کے پیڑ کے پتے سرسرانے لگے۔

دوسرے روز ملک صاحب کے والد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے دیر تک گاؤں والوں کی تعلیمی حالت اور اقتصادی بدحالی پر گفتگو کی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ شہر کے پڑھے لکھے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ دیہات میں آ کر یہاں کے لوگوں سے براہ راست ملیں اور ان کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں انہیں تعلیم دیں، میں بھی انکے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ نورا نامی حجام استرے کو ہتھیلی پہ تیز کرتا ہوا ڈیرے میں داخل ہوا۔

"سلام علیکم! بابو صیب کب لاہب؟"

میں سہم گیا اور پرے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ مگر اب قربانی کے بکرے کا قصاب کی چھری سے بچنا محال تھا۔ چنانچہ نورے نائی نے بڑے آرام سے قریب ہو کر میری داڑھی کے بال پانی سے تر کرنے شروع کر دیئے۔ معلوم ہوا کہ وہ بغیر صابن کے شیو کرے گا۔

"اجی صابن تو اناڑی نائی استعمال کرتے ہیں۔"

میں کانپ اٹھا اور دل میں یا شافی یا کافی کا وظیفہ پڑھنے لگا۔ نورے نے استرا پھیرتے ہی گال پر ایک خوبصورت کٹ لگا یا۔ میں خون پی کر بیٹھا رہا، اور اس کٹ کے خیال سے درد کو ٹالتا رہا جو ابھی لگتا تھا۔

"بابو جی اگر داڑھی رات ہی سے بھگوئی ہوئی ہو تو بڑی آسانی ہوتی ہے۔"

"مگر وہ کیسے۔؟"

"بس گیلا کپڑا باندھ کر سو جاتے۔ پھر استرا یوں پھرتا۔ جیسے دمڑے میں جوائی پھرتا ہے۔"

جب نورے نے میرا گال خون سے رنگ دیا، تو میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"عزیزی نورے! میری داڑھی پر رحم کر۔ اب سوائے اس کے میرے پاس کچھ نہیں رہا۔"

مگر نورے نے ایک نہ سنی۔ میں نے پوچھا۔

"عزیزی نورے! تو پہلے کیا کام کرتا تھا۔"

نورے نے کہا۔

بھیڑیں مونڈا کرتا تھا۔

اگلے روز میں صبح ہی صبح چک ٹھرانے سے چل پڑا۔ ملک صاحب نے مجھے جو گھوڑا دیا اُسے لات مار کر انہوں نے خود ہی سٹارٹ کیا۔ راستے میں جب اُسے چلانے کی کوشش کرتا تو وہ رک جاتا۔ اور جب اسے روکنے کی کوشش کرتا تو وہ چل پڑتا وہ چلتا کم اور اُچھلتا زیادہ تھا۔ لالیاں تک آتے آتے اس ستم ظریف گھوڑے نے میرا انجر پنجر ڈھیلا کر دیا۔ لالیاں ملک صاحب کے ڈیرے پر پہنچ کر جب میں گھوڑا واپس دینے کے لئے اترا تو میری ٹانگیں لڑکھڑائیں اور میں دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ میری ٹانگیں جواب دے چکی ہیں۔ اور میں اترتے ہی زمین پر ڈھیر ہو جاؤں گا۔ تو میں گھوڑے سے کبھی نہ اترتا۔ بلکہ وہاں سے سیدھا لالیاں کے ہسپتال کا دروازہ جا کر کھٹکھٹاتا۔ دیہات کی خوبصورت رومانی سیر کے اس تجربے کے بعد میں اس مصنف کی تلاش میں ہوں جس نے اُردو کی دوسری کتاب میں گاؤں کی بہار نام کا مضمون لکھا تھا۔

. . . .

ہیرو کا خط

پیاری ماں!
خدا تمہیں سلامت رکھے۔

یہاں پر ہر طرح سے خیریت ہے اور تمہاری خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں، بعد میں واضح ہو کہ میں یہ خط خود نہیں لکھ رہا۔ بلکہ اپنے ایک دوست سے لکھوا رہا ہوں۔ جو ہمارے فلم کے دفتر میں چپڑاسی ہے تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں نے گاؤں کے سکول میں چوتھی جماعت کا امتحان پاس کرلیا تھا۔ اور میں تمہیں خود خط لکھنا چاہتا تھا۔ مگر کل میں اپنے دفتر کے مالک یعنی پروڈیوسر صاحب کے گھر رات کو برتن مانجھ رہا تھا کہ شیشے کے ایک ٹوٹے ہوئے جگ کے ساتھ لگ کر میری انگلی کٹ گئی۔ میں نے دوائی لگوا کر پٹی باندھ رکھی ہے۔ تم فکر نہ کرنا۔

تم سے اپنے پیارے گھر سے اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گھرے ہوئے خوبصورت گاؤں سے بچھڑے آج چار سال ہو گئے ہیں۔ ان چار سالوں میں تمہارے بیٹے پر کیا کچھ نہیں بیتی؟ کیا کیا کچھ یاد نہیں آیا؟ کیسی کیسی شکلیں آنکھوں کے سامنے نہیں گھومیں؟ کہاں کہاں کی خاک میں نے نہیں چھانی؟ ماں اگر میں اپنی ساری داستان لکھنے بیٹھوں تو لاہور شہر کی دکانوں کے سارے کاغذ ختم ہو جائیں گے، اور میرا ایک بھی قدم بھرا تجربہ قلمبند نہ ہو سکے گا۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے ماں کہ مجھے فلموں میں کام کرنے کا اور ہیرو بننے کا بڑا شوق تھا۔ اور اسی شوق نے مجھے تم سے اور اپنے گھر سے جدا ہونے پر مجبور کیا تھا۔ میں گھر سے بھاگ نکلا اور سیدھا لاہور آ گیا۔ یہاں میرا کوئی بھی واقف نہ تھا۔ میرے پاس سات روپئے اور کچھ آنے تھے۔ رات ایک سرائے میں بسر کی۔ سارا دن فلمی دفتروں اور سٹوڈیوز کے چکر کاٹتا رہا۔ کہیں بھی کام نہ ملا، ہفتے بھر کی دربدری کے بعد ایک حلوائی نے مجھے نوکر رکھ لیا۔ میں منہ اندھیرے اٹھ کر دکان کھولتا۔ بھٹی گرم کرتا۔ کڑاہے مانجھتا دن بھر دکان پر اور حلوائی کے گھر پر کام کرتا۔ وہ مجھے مارتا، مگر میں ہنستا رہتا۔ میں انہیں چارلی چپلن کی نقلیں اتار کر دکھاتا۔ اور وہ بہت خوش ہوتے۔ رات کے بارہ بجے جب حلوائی کا دودھ ختم ہو جاتا تو میں بازار میں کڑاہیاں رکھ کر انہیں مانجھتا۔ کوئی دو بجے سوتا اور صبح پانچ بجے پھر اٹھ بیٹھتا یہ حلوائی مجھے صرف دو وقت روٹی۔ ایک وقت لسی اور رات کو پاؤ بھر دودھ پینے کو دیتا تھا۔

کوئی ایک سال اس پہلوان حلوائی کے پاس رہنے کے بعد مجھے ایک نانبائی نے دس روپے ماہوار اور روٹی کپڑے پہ ملازم رکھ لیا۔ یہاں حلوائی کی دکان سے زیادہ کام کرنا پڑتا تھا۔ نانبائی رات کے تین بجے ہی سلاخ مار کر جگا دیتا۔ من من بھر کا خمیر گوندھنا پڑتا۔ پھر چار گھنٹے تپتے ہوئے تنور کے اوپر بیٹھ کر چپاتیوں کو قطار میں لگانا پڑتا۔ یہاں میری آنکھیں دکھنے لگیں۔ میں بیمار پڑ گیا۔ نانبائی نے مجھے نکال دیا۔ میں پھر دربدر پھرنے لگا۔ ایک حکیم صاحب نے رحم کھا کر میرا علاج کیا۔ اور گھر پہ ملازم رکھ لیا۔ لیکن میرے دل میں تو فلموں میں ہیرو بننے کی لگن تھی۔ یہی وہ شوق تھا۔ جس کی خاطر میں نے اپنی پیاری ماں کو چھوڑا تھا۔ اپنے پیارے گھر اور مکئی کے بھٹوں والے ہرے بھرے کھیتوں کو چھوڑا تھا۔ میں چپکے چپکے فلم والوں کے دفتروں کے چکر کاٹتا رہا اور اپنے لئے نوکری تلاش کرتا رہا۔ آخر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ کوئی دو سال بعد مجھے ایک فلمی سٹوڈیو میں قلی کی نوکری مل گئی۔ میں بڑا خوش تھا لیکن ایک مہینے میں ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ اگر میں اس جگہ ساری عمر بھی پڑا رہوں تو ہیرو کبھی نہیں بن سکتا۔ وہاں میرا سوائے کیمرے، لائٹیں، لکڑی کے کندے اٹھانے اور ہر ایرے غیرے کی جھڑکیاں کھانے اور ماں بہن کی گالیاں سننے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ آخر میں نے ایک پروڈیوسر کی منت کی، اور اس نے میرے حال پہ مہربانی کر کے مجھے اپنے دفتر میں چپڑاسی رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مجھے فلم میں ہیرو ضرور بنا دے گا۔

میں نے پہلے ہی روز دفتر میں جا کر اپنے پروڈیوسر صاحب ٹوری رائٹر صاحب اور ڈائرکٹر صاحب کو ڈائیلاگ بول کر سنائے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ پھر میں نے مسخرے کا پارٹ کر کے دکھایا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر گھٹنے ٹیک کر آنکھیں گھما کر لرزتے ہوئے کہا "ارے باپ رے باپ"
ہنس ہنس کر سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اس کے بعد دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بال ماتھے پر ڈال لئے اور گردن جھٹکا کر بولا۔ "سیٹھ صاحب! میں بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا، آپ کو یہ شادی کرنی ہی ہوگی۔ ورنہ خون کے بدلے خون کیونکہ جہانگیر کا یہی انصاف ہے"
اس پر ان لوگوں نے خوش ہو کر خوب تالیاں بجائیں۔ میرا دل شیر ہو گیا۔ سب نے میرے کام کی تعریف کی، اور جانتی ہو ماں پھر کیا ہوا؟ پھر ڈائرکٹر صاحب نے میری پیٹھ تھپتھپا کر کہا۔
"علی احمد آج سے تمہارا نام ہیرو ہے۔ بس تم میری اگلی فلم کے ہیرو ہو گے"
ماں خوشی سے میرا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ میں نے اپنے مقصد کو پا لیا تھا۔ لیکن افسوس کہ اگلی فلم میں جب پروڈیوسر صاحب مجھے ہیرو لینے ہی والے تھے کہ کمبخت اوپر سے اسلم پہنچ گیا۔ اور مجبور ہو کر پروڈیوسر نے اُسے ہیرو بنا لیا۔ مگر بعد میں پروڈیوسر صاحب نے مجھ سے معافی مانگ لی اور وعدہ کیا کہ اگلی میں میرے سوا اور کوئی ہیرو نہیں ہوگا۔
بس ماں! اب میں ضرور ہیرو بن جاؤں گا میں چاہتا ہوں۔ ماں کہ

تم میرے لئے بہت اداس ہوگی۔ اور مجھے یاد کرکے روتی ہوگی۔ میں بھی تمہیں بہت یاد کرتا ہوں۔ ماں میں بھی ہر رات جب میں اپنی چارپائی پر لیٹتا ہوں تو تمہیں یاد کرکے رو دیا کرتا ہوں۔ لیکن ماں میں گھر سے جو ارادہ باندھ کر نکلا ہوں۔ اس میں کامیاب ہوکر ہی گھر واپس لوٹوں گا۔ یہ میری ساری زندگی کا سوال ہے۔

ذرا سوچو ماں! جب میں ہیرو بن گیا اور گاؤں میں میری فلم دیکھ کر لوگوں نے تمہیں مبارک دی، اور اخبار والوں نے میری تصویریں چھاپیں اور نیچے لکھا کہ "فلمی دنیا کے مشہور ہیرو۔" تو تمہیں کتنی خوشی ہوگی، پھر جب تم اپنے پیارے بیٹے کو سنیما کے پردے پر اپنی آنکھوں سے دیکھوگی کہ وہ ہیرو بن کر دشمنوں سے جنگ کر رہا ہے۔ تلوار چلا رہا ہے۔ آنکھیں بند کرکے سگریٹ پی رہا ہے۔ ہیروئن کو بچا کر گھوڑے پہ لاد کر بھاگا جا رہا ہے اور اپنے مکوں سے دشمنوں کے دانت توڑ رہا ہے۔ تو خوشی سے تمہارا سیروں خون بڑھ جائے گا۔ پھر تم اپنے بیٹے پر فخر کروگی اور گردن بلند کرکے ہمسایوں اور رشتہ داروں سے کہہ سکوگی۔

"میرا بیٹا تو ہیرو ہے۔ ہیرو ہے ہیرو۔ کوئی اُس کی جوتی کا تو مقابلہ کرے۔ وہ تو لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔

پھر اُن تمام رشتہ داروں کی زبانیں بند ہو جائیں گی، اور وہ تمہیں کبھی یہ طعنہ نہیں دیں گے کہ تمہارا بیٹا آوارہ ہے۔ پھر تو وہ تم سے حسد کرنے لگیں گے۔

اور پھر میں تمہیں گاؤں میں تھوڑی رکھوں گا، میں تمہیں اپنی کوٹھی میں بلا لوں گا۔ خود کار لے کر گاؤں تمہیں لینے آؤں گا، میرے کپڑے دیکھ کر گاؤں والے دنگ رہ جائیں گے۔ تمہاری خدمت کو چار چار نوکر ہوں گے۔ تم چائے کے ساتھ پیسٹری کھایا کروگی، اور ماں میں شادی تمہاری مرضی سے کروں گا۔ میں دوسرے ہیروؤں کی طرح کسی ہیروئن سے شادی نہیں کروں گا۔ کیونکہ ہیروئنیں اچھی بیویاں نہیں بن سکتیں، ظاہر ہے۔ پھر ایسی تو ہزار عورتیں میرے پیچھے لگ جائیں گی۔

میں کسی کو منہ نہیں لگاؤں گا، میں تو وہیں شادی کروں گا، جہاں تم کہو گی۔

پیاری ماں! میں ایک مدت کے بعد تمہیں خط لکھ رہا ہوں مجھے معاف کر دینا۔ ان چار سالوں میں تو تم اور بوڑھی ہو گئی ہوگی۔ خدا تمہیں میرے سر پہ ہمیشہ سلامت رکھے۔ آمین! بات یہ تھی کہ میں تمہیں اس وقت خط لکھنا چاہتا تھا۔ جب میں اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاؤں۔ یہ بات نہیں تھی کہ میں بھول گیا تھا یا میں تمہیں خط لکھنا نہیں چاہتا تھا۔ ایسی بات کبھی دھیان میں نہ لاتا۔

ماں، میں تو تمہیں ہر وقت یاد کرتا رہتا ہوں۔ تم نے میرے لئے کیا کیا دکھ نہیں جھیلے! جب خیال آتا ہے تو کونے میں منہ چھپا کر رو دیتا ہوں۔ میں نے تمہیں ایک بھی تو سکھ نہیں دیا۔

میں صرف یہ چاہتا تھا کہ اپنے پہلے خط میں ہی تمہیں یہ خوشخبری

سناؤں کہ میں فلمی دنیا میں داخل ہو گیا ہوں ، اور بہت جلد کسی فلم میں ہیرو بن کر آرہا ہوں ۔ سو خدا کا شکر ہے کہ خدا نے آج مجھے اس قابل بنا دیا کہ میں آپ کو یہ خوشخبری سنا سکوں ۔ اگرچہ میں اس دفتر میں ابھی چپڑاسی ہوں ۔ مگر سب لوگ مجھے ہیرو کہہ کر پکارتے ہیں ۔ اور وہ دن دور نہیں جب میں واقعی ہیرو بن جاؤں گا ، میرا کام دفتر میں آنیوالے لوگوں کے لئے بازار سے چائے لانا ۔ پان ، سگریٹ لانا ۔ دفتر میں جھاڑو دینا ۔ پروڈیوسر کا حقہ تازہ کرنا ۔ ڈائریکٹر کے پاؤں دبانا ۔ سٹوری رائیٹر کے سر کی مالش کرنا ۔ پروڈکشن ڈائریکٹر کے پاؤں کے ناخن اُتارنا ۔

پروڈیوسر کے بچوں کو سکول لے کر جانا ، سارے گھر والوں کے جوتے پالش کرنا ، ان کے گندے مندے کپڑے دھونا ۔ برتن مانجھنا اور پروڈیوسر کے بچوں کی گالیاں سننا ہے ۔ لیکن ہیرو بننے کے لئے ان مصیبتوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے ۔ اب تو ان لوگوں نے میری قابلیت کا لوہا مان لیا ہے ۔ ورنہ وہ مجھے کبھی ہیرو کے نام سے نہ پکارتے ۔

اب میں تمہیں سب سے بڑی خوشخبری سناتا ہوں ۔ وہ یہ ہے ، کہ ابھی کل ہی پروڈیوسر صاحب نے سب لوگوں کی موجودگی میں مجھ سے اگلی فلم کا معاہدہ کر لیا ہے ۔ کاغذ پر انگریزی لکھی تھی ۔ میں نے دستخط کر دیئے ۔ پھر انہوں نے مجھے پھولوں کے ہار پہنائے اور بطور پیشگی سوا روپیہ بھی دیا ۔

ایک سیر لڈو بانٹے گئے۔ ماں جب کوئی ہیرو بنتا ہے اور معاہدے پر دستخط کرتا ہے تو ایسے ہی ہوتا ہے۔ یہاں کی رسم ہے کہ معاہدہ ہو جانے پر یا تو پانچ سو روپے دیئے جاتے ہیں یا سوا سو روپیہ اور یا سوا روپیہ چونکہ میرے پروڈیوسر صاحب کی جیب میں اس وقت سوا روپیہ ہی تھا۔ اس لئے وہ مجھے زیادہ نہ دے سکے۔ مگر مجھے پیسوں کی پرواہ نہیں، ماں میں ایک بار ہیرو بن گیا، تو میرے چاروں طرف روپیہ ہی روپیہ ہوگا۔

کل ہی شام کو ملک کی مشہور ہیروئین مس تحیّر سلطانہ ہمارے دفتر میں تشریف لائیں انہیں جب معلوم ہوا کہ میں اگلی فلم میں ان کے ساتھ ہیرو آرہا ہوں۔ تو انہوں نے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا۔

"مبارک ہو۔"

میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ میں نے کنکھیوں سے اپنی اگلی فلم کی ہیروئین کو دیکھا، مجھ سے قد لمبی ہے۔ مگر پھر کیا ہے میں اُسے اپنی ہیروئین کے مطابق ڈھال لوں گا۔

ننھا! تم خوش نہیں ہو۔ اب تو میں ہیرو بن گیا ہوں۔ بس اگلی فلم کے اعلان ہونے کی دیر ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں جس ارادے کے ساتھ گھر سے نکلا تھا۔ اُس میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اور باقی سب خیریت ہے۔ مجھے گھر بہت یاد آتا ہے۔ ماں اب تو ہمارے آنگن والی بیری بڑی ہوگئی ہوگی، اور بکری نے بھی بچے دے دیئے ہوں گے۔ پیپل تلے میدان میں شام کو کبڈی ہوتی ہوگی۔ تم بھی باؤلی پہ کپڑے دھونے جاتی ہوگی۔

فکر نہ کرو ماں، میں ہیرو بننے کے بعد تمہیں شہر میں لا کر اپنی کوٹھی میں رکھوں گا۔ اور نوکر کپڑے دھویا کریں گے۔

باقی یہاں ہر طرح سے خیریت ہے۔ میں تمہاری خدمت میں صرف پانچ روپے منی آرڈر کر رہا ہوں۔ میں بڑا شرمسار ہوں کہ چار سال بعد پانچ روپوں کی حقیر رقم بھیج رہا ہوں۔ مگر کیا کروں ایک سال سے تنخواہ نہیں ملی۔

اور ماں گھر میں کوئی فالتو کھیس ہو تو کسی آنے جانے والے کے ہاتھ بھجوا دینا۔ کیونکہ میرا کھیس جواب دے گیا ہے۔ کمبل بھی پھٹ گیا ہے۔ رات کو بڑی سردی لگتی ہے۔ دوسرے جسم پر پھوڑے خارش نکل آئی ہے۔ حکیم کی دوائی لگاتا ہوں۔ فکر نہ کرنا، رات کو نیند نہیں آتی۔ کمر پہ ایک پھوڑا سا نکل آیا ہے۔ پروڈیوسر نے ایک روز روپیہ دیا تھا کہ ہسپتال جا کر داخل ہو جاؤں۔ وہاں گیا تو ڈاکٹر نے کہا کہ اس کا آپریشن ہو گا۔ میں بھاگ آیا۔ کبھی کبھی رات کو بہت کھانسی آتی ہے۔ اتنا کھانستا ہوں کہ سانس گھٹنے لگتا ہے۔ لیکن فکر نہ کرو ماں۔ ہیرو بن گیا تو سب بیماریاں دور ہو جائیں گی۔

اب میں خط ختم کرتا ہوں۔ آنگن والی بیری اور بکری کو میرا پیار دینا۔ میرے ساتھ کبڈی کھیلنے والوں کو سلام کہنا۔

اور ہاں کھیس کسی آتے جاتے کے ہاتھ ضرور بھجوا دینا۔ کیونکہ رات کو بڑی سردی لگتی ہے۔

اور۔

اگر گھر میں اس دفعہ گڑ بنا ہو تو تھوڑا سا گڑ بھی بھجوا دینا۔

ماں! ایک بات بتاؤں گی — زینب کی ابھی شادی تو نہیں ہوئی نا؟

اچھا ماں پھر سہی۔

فقط تمہارا بیٹا

علی احمد ہیرو

. . . .

فلمی قربانی کے بکرے

عیدالاضحیٰ کا خوشگوار دن ہے۔ شہر میں چاروں طرف خوب رونق ہے۔ قصاب چھری بغل میں دبائے، منہ میں کلمہ شریف کا ورد کرتے بکروں کی تلاش میں گلی گلی بھاگے پھر رہے ہیں۔ بکروں کی گھگھی بندھ گئی ہے۔ ان کے رنگ اڑے اڑے سے ہیں اور آنکھیں خوفزدہ ہیں۔ بقو تھنیاں لٹکی ہوئی ہیں۔ وہ رحم طلب نگاہوں سے کبھی اپنے گھر کو اور کبھی گھر والوں کو اور کبھی قصاب کو دیکھ رہے ہیں۔ کل تک انہیں کس محبت سے لڈو پیڑے کھلائے جا رہے تھے اور آج کتنی بے دردی سے ذبح کیا جا رہا ہے۔ بے زبانی سے ہر ایک کا منہ تکتے ہیں۔ مگر زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کل تک ان کی مائیں ان کی خیر منا رہی تھیں۔ آج وہ اپنی خیر منا رہی ہیں۔ بکروں کی..... گردنوں پر چھریاں چل رہی ہیں۔ کھالیں اتر رہی ہیں۔ گوشت تقسیم ہو رہا ہے

تکمے بنائے جارہے ہیں۔ خوب رونق ہے۔

اس رونق اور چہل پہل میں ہماری فلمی دُنیا بھی شہروالوں سے پیچھے نہیں ہے۔ فلمی ماحول میں بھی عیدالاضحیٰ پورے جوش وخروش سے منائی جارہی ہے۔ یہاں بکروں اور دُنبوں کو سجا بنا کر قربانی کے لئے تیار کیا جارہا ہے۔ اور ثواب دارین حاصل کرنے کے جتن کئے جارہے ہیں۔ ہم آپ کو فلمی بکروں سے ملاتے ہیں۔

یہ بکرا جس کی چگی داڑھی ہے۔ اور آنکھوں پہ عینک لگی ہے۔ فلمی کہانی نویس ہے۔ سبحان اللہ! کس قدر مرنجان مرنج بکرا ہے۔ گلے میں ان چیکوں کا ہار ہے۔ جو پروڈیوسر کی طرف سے ملے، مگر کیش نہیں ہوئے۔ فلمی دفتر کے ایک کونے میں زمین پہ بیٹھا ہے۔ ایک طرف چائے کا کپ پڑا ہے۔ سامنے تھالی میں بھنے ہوئے چنے رکھے ہیں۔ تھوتھنی میں کنگا۔ اسٹار کا سگریٹ سلگ رہا ہے۔ رجسٹر کھلا ہوا ہے۔ اور کہانی نویس بکرا سر جھکائے فلم کے مکالمے لکھ رہا ہے۔ نہیں بلکہ ایک کاغذ کے پرزے پہ یہ سطور لکھ رہا ہے۔

" مکرمی جناب پروڈیوسر صاحب!

گذارش ہے کہ فدوی کو عرصہ چھ ماہ سے طے شدہ رقم میں سے کوئی قسط نہیں ملی، فدوی بڑا پریشان ہے۔ فدوی عرصہ چھ ماہ سے صرف چنوں پہ گزارہ کر رہا ہے۔ اگرچہ فدوی بکرا ہے لیکن اس کا بھی دل چاہتا ہے کہ وہ بھی دوسرے بکروں کی طرح ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر کی سیر کرے! مولا بخش کے پاس

کھائے۔ خیراتی میں بیٹھ کر چائے پیے اور کولمبس ہوٹل میں رات کو ڈانس دیکھے۔ فدوی کی حالت زار پر رحم کھا کر اسے دس روپے ایڈوانس دینے چاہئیں۔

بقلم خود
فدا بخش بکرا کہانی نویس فلمی

دروازہ کھلتا ہے اور پروڈیوسر داخل ہوتا ہے وہ مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہتا ہے۔

"کیوں منشی جی کوئی تازہ ڈائیلاگ ہوا کیا۔؟"

کہانی نویس بکرا خط پروڈیوسر کو تھما دیتا ہے۔ پروڈیوسر خط پڑھ کر غصے میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

"تم کتنے کمینے آدمی ہو خدا بخش بکرا۔ میں تمہیں ترقی دے کر ڈائریکٹر بنانے کی فکر میں ہوں اور تم مجھ سے پیسے مانگ رہے ہو! مجھے ڈائی لاگ چاہئے ڈائیلاگ۔ ایسے واہیات خط نہیں۔"

کہانی نویس بکرا زور سے ممیاتا ہے اور رجسٹر پر تھوتھنی ڈال کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ پروڈیوسر چلا جاتا ہے۔ کہانی نویس بکرا نالی میں سے چنے منہ میں لے کر جگالی کرنے لگتا ہے۔ اس کی سفید سفید لٹیں پر مہندی سے چاند تارا بنا ہے۔

سین آخری مقام مقتل۔ کردار صرف "صاب" وقت۔ ترنٹ،

تھوڑی دیر میں ڈائریکٹر بغل میں چھری لئے اور منہ سے بڑی میٹھی میٹھی
باتیں کرتا، کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ کہانی نویس بکرے کے اوپر سبز رنگ
کا گوٹ لگا غلاف ڈالتا ہے۔ اس کی رسی تھامتا ہے اور پچکارتا ہوا اسے
ذبح کرنے کے لئے لے جاتا ہے۔

دوسرا قربانی کا بکرا ایک فلم پروڈیوسر ہے۔ یہ بکرا جب پہلے پہل خریدا
گیا تھا۔ تو بڑا تنومند اور موٹا تازہ تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس
کی صحت گرتی چلی گئی۔ رنگ پیلا پڑ گیا۔ تھوتھنی سکڑ گئی۔ آنکھیں پتھرانے
لگیں۔ ہیروئن، ہیروئن اماں، دادی، نانی، بہن، ماموں اور اس کے
رشتہ داروں اور ڈائریکٹر کو خون پلا پلا کر بدن لاغر و کمزور ہو گیا۔ اب
یہ بکرا صاحب اپنے فلمی دفتر کے سجے ہوئے کمرے میں بندھے پڑے ہیں۔
قوام والے پان سامنے رکھے ہیں۔ وہ منہ میں ہیں۔ بار بار ہاتھ گردن پر
پھیر کر گلے میں بندھی ہوئی رسی کو دیکھ لیتے ہیں۔ ان کو ذبح کرنے کے لئے
ہیروئن اس کی ماں اس کے رشتہ دار ڈائریکٹر صاحب اور ڈائریکٹر صاحب
کے اسسٹنٹ اور سینما کے ایگزیبیٹر صاحب چھریاں تیز کر رہے ہیں۔ سرخ
رنگ کا گوٹ لگا دوپٹہ جسم پر ڈال رکھا ہے۔ سامنے کھاتہ کھلا پڑا ہے کھاتے
میں بڑھتے ہوئے اخراجات کو دیکھ کر بار بار اپنا کھُر اپنے سر پہ مار رہے
ہیں اور ممیاتے ہوئے آہ و زاری کر رہے ہیں۔ گلے میں ہیروئن۔ اسکی
اماں، نانی، رشتہ داروں، ڈائریکٹر اور ہوٹل والوں کے ہاروں کے ہار
پڑے ہیں۔ اچانک دروازہ کھلتا ہے اور ڈائریکٹر صاحب ہیروئن اور

ہیروئن کی بوڑھی اماں یا نانی اماں کے ساتھ داخل ہوتے ہیں۔ پروڈیوسر بکرا کانپ اٹھتا ہے۔ داخل ہونے والوں کے چہروں پر مسکراہٹ ہے۔ اور بغلوں میں چھرے پوشیدہ ہیں۔ وہ باری باری پروڈیوسر بکرے کے سر پر ہاتھ پھیر کر پیار کرتے ہیں۔ اُسے پچکارتے ہیں۔ اخاہ کتنا پیارا بکرا ہے۔ ہمیں کوہ مری کی سیر بھی کروا تا ہے۔ ہمارے ہوٹلوں دھوبی نائی سبزی والا، دودھ والا اور پنساری کے بل ادا کرتا ہے۔ ہمارے عاشقوں کو سر آنکھوں پر بٹھلاتا ہے۔ جہاں دس روپے سے کام چل سکتا ہے، وہاں ہزاروں روپے خرچ کر دیتا ہے۔ ہیروئن پیار سے بکرے کی داڑھی پکڑ کر ذرا کھینچتی ہے، اور مسکراتی ہے۔

پیارے بکرے! میں تجھے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ میں تو تیرے سری پائے کھاؤں گی۔ مجھے سری پائے بڑے پسند ہیں۔ ہیروئن کی نانی کہتی ہے اور میں صرف گردن کا گوشت کھاؤں گی۔" پروڈیوسر بکرا تھوتھنی ہلاتا رہا اور زار و قطار روتا رہا۔ مگر چونکہ بے زبان تھا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ عید کی شام کو اُسے ذبح کر دیا گیا، اور اس کے سری پائے ہیروئن لے گئی۔ گردن ہیروئن کی ماں کے حصے میں آئی۔ ڈائریکٹر نے سینے کا گوشت اٹھا لیا۔ اور باقی گوشت سینما ایگزیبیٹروں، اسٹوڈیو کے مالکوں، خام مٹیریل والوں، انکم ٹیکس والوں اور ہیروئن کے رشتہ داروں میں بانٹ دیا گیا جنہوں نے نہایت مزے لے لے کر کھایا۔

یہ تیسرا بکرا نہیں بکری ہے۔ یہ ایک ایکسٹرا لڑکی ہے۔ یہ بکری اس

شہر میں فلمی ہیروئن بننے کا خواب لے کر سپاٹ دلی سے آئی تھی۔ لیکن عرصہ چھ سال سے صرف ایکسٹرا رول کر رہی ہے۔ اس کی تھوتھنی بڑی پیاری ہے آنکھیں کالی کالی ہیں۔ تھوتھنی پر لپ اسٹک لگی ہے۔ کھروں پر نیل پالش لگا ہے۔ تھن کافی بڑے بڑے ہیں۔ اور اس دودھ سے بھرے ہوئے ہیں جس میں پانی ملا ہوا ہے۔ اور جو اس کے بچوں کے نصیب میں نہیں ہے۔

اس نے عرصہ چھ سال سے ڈائریکٹروں، پروڈیوسروں، ایکسٹرا سپلائروں کیمرہ مینوں، میک اپ مینوں۔ فلمی کہانی نویسوں، اور فلمی گیت نگاروں کو بغیر مینگنیاں ڈالے دودھ دیا ہے۔ مگر کسی نے اس دودھ کی لاج نہیں رکھی۔ یہ ایکسٹرا بکری آئینہ سامنے رکھے رو رہی ہے۔ اس کا بدن سیاہ دوپٹے سے ڈھکا ہوا ہے۔ جس پر عید مبارک اور "مکس اچو" لکھا ہے۔ اسے ذبح کرنے کا ثواب ایکسٹرا سپلائر حاصل کرے گا۔ اور پھر اس کا گوشت اسٹوڈیو کے ہر آدمی کے درمیان بانٹ دیا جائے گا۔ زیادہ رغبت سے اس بکری کو فلم پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور کہانی نویس نوش جان کریں گے۔

اس چوتھے بکرے کا نام حرام خور ہے۔ یہ بکرا ایک خوبصورت بھرے بھرے سینے والی ایک شوخ چشم ایکٹریس کا خاوند ہے۔ یہ بکرا ایک سجے ہوئے بنگلے کے کمرے میں ٹھنڈی وہسکی پی رہا ہے۔ اور بار بار ریشمی رومال سے اپنی لٹکی ہوئی تھوتھنی پونچھ رہا ہے۔ اس کے گلے میں جو تنبول کا ہار ہے لیکن ہر تنبولی کے ساتھ سو سو روپے کا نوٹ ٹنکا ہوا ہے۔ ساتھ ہی ایک پرچہ

لگا ہے جس پر لکھا ہے کہ ہم تمہاری بیوی کو ہیروئین کا رول دیں گے ۔ نیچے
فلمی لوگوں کے دستخط ہیں۔ یہ بڑا موٹا تازہ بکرا ہے ۔ وہسکی بھی پی رہا ہے
اور لطیفوں کی کتاب بھی پڑھ رہا ہے۔ ہر لطیفے پر زوردار قہقہہ لگاتا ہے۔
کبھی ماشا اچھالتا ہے۔ اور کبھی پورا اکیلا ہضم کرجاتا ہے۔ یہ وہسکی، اور
پھل اس کی بیوی کا ایک پروڈیوسر دوست دے گیا تھا۔ اسکی ایکٹریس
بیوی کو شوٹنگ پہ لے گیا تھا۔ اس بکرے کی توند نکلی ہوئی ہے۔ اور کمر پہ
سیاہ چادر پڑی ہے۔ اس پہ سنہری حروف میں LIGHTS OFF - لکھا
ہے۔ حال ہی میں اس کی ایکٹریس بیوی نے ایک عدد بچی کو جنم دیا ہے۔ بچی
بڑی پیاری ہے۔ اس کی شکل فلمی دنیا کی کئی ایک ہستیوں سے ملتی جلتی ہے۔
چنانچہ ایکٹریس ماں نے اس کا نام ڈی نالو رکھا ہے۔ اس بکرے کی
ایکٹریس بیوی ایک نئے پروڈیوسر کے ساتھ مری گئی ہوئی ہے پروڈیوسر
اپنی نئی فلم کے لئے پہاڑ کے مناظر اور بکرے کی ایکٹریس بیوی کو قریب سے
قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ ایکٹریس کا بکرا خاوند اپنے بنگلے کے ڈرائنگ۔
روم میں بیٹھا پیٹ پہ گھر پھیرتے ہوئے وہسکی پی رہا ہے۔ یہ پہلا بکرا ہے۔
جو اپنی چھری سے دوسرے بکروں کو ذبح کرتا ہے۔ اور خود کبھی ذبح
نہیں ہوتا۔ اور جب کبھی اس کا جھٹکا ہوا تو اس کا گوشت صرف چیل
کوّے ہی کھا سکیں گے۔

پانچواں بکرا ڈسٹری بیوٹر یعنی فلم کو خرید کر آگے چلانے والا ہے۔ یہ
ایک یتیم بکرا ہے۔ باپ کی وفات پہ کچھ روپے لے کر فلمی دنیا میں آیا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ اس چراگاہ میں ہری بھری گھاس مل جائے گی لیکن آتے ہی پڑانے گھاگھ ڈسٹری بیوٹروں نے اسے ایسی ٹکر دی کہ نانی یاد آگئی۔ اوپر تلے اُس نے بھاری رقمیں خرچ کر کے تین ایسی فلمیں خرید لیں جو فلاپ ہو گئیں۔ پہلے ہی شو میں سینما ہال میں کرسیاں چل گئیں جس کے نتیجہ میں اس یتیم ڈسٹری بیوٹر کا دماغ چل گیا۔ سارا روپیہ غرق ہو گیا۔ دفتر کا فرنیچر تک بک گیا۔ دوست بھاگ گئے۔ قرض واپس لینے والوں نے مار مار کر بکرے سے دُنبہ بنا دیا۔ پاگل ڈسٹری بیوٹر بکرا شہر کے ہر چوک میں تھوتھنی اٹھا کر واویلا کرتا رہا۔ مگر کسی نے اسکی فریاد نہ سنی۔ اب یہ بکرا اکیلا ایک فلمی اسٹوڈیو کے باہر دیوار کے ساتھ بیٹھا ہوا جگالی کرتا رہتا ہے۔ اس کے اُوپر جو چادر پڑی ہے۔ اس پہ جلی حروف میں لکھا ہے FADE OUT ۔ اس کے گلے میں ان رسیدوں کا ہار ہے۔ جو اس نے پروڈیوسروں سے فلمیں خرید کر انہیں بھاری رقمیں دیکر حاصل کی تھیں۔ یہ بکرا ان رسیدوں کو منہ میں ڈالے جگالی کرتا رہتا ہے۔ اور کسی سے بات نہیں کرتا۔ اس کے چاروں طرف ناکام فلموں کے ڈبے کھلے پڑے ہیں، اور وہ اپنی تھوتھنی گھما گھما کر ہر ڈبے کو حسرت و یاس بھری نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ اسے عید پہ ناکام فلموں کے پروڈیوسر ذبح کریں گے۔ اور پھر آپس میں اس کا گوشت بانٹ لیں گے۔ لیکن چونکہ یہ بکرا پاگل ہو چکا ہے۔ اس لئے قیاس غالب ہے کہ اس کا گوشت کھا کر پروڈیوسر بھی پاگل ہو جائیں گے۔

چھٹا بکرا ایک عام سنیما دیکھنے والا آدمی ہے۔ یہ بکرا ہوشیار بھی ہے نافل بھی ہے۔ چالاک بھی ہے۔ نرم دل بھی ہے سخت دل بھی ہے۔ لفنگا بھی ہے۔ قہقہے بھی لگاتا ہے۔ سنیما ہال میں تالیاں بھی پیٹتا ہے اور کرسیاں بھی توڑتا ہے اور بعض اوقات پروڈیوسر ڈائرکٹر، رائٹر اور ڈسٹری بیوٹر کی کمر ہمت بھی توڑ دیتا ہے۔ کبھی کبھی یہ پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کو اپنے سینگوں پر اُچھال کر کامرانی و کامیابی کی ساتویں منزل پر پہنچا دیتا ہے۔ اور کبھی اس بُری طرح پیٹ میں ٹکر مارتا ہے کہ پروڈیوسر ڈائرکٹر پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور پھر کبھی اُٹھنے کا نام نہیں لیتا۔

یہ بکرا دس آنے والی کلاس میں بیٹھا سگرٹ منہ میں ڈالے جگالی کر رہا ہے اور بڑے انہماک سے پردۂ سیمیں کو دیکھ رہا ہے۔ اس نے بڑے غور سے اس فلم کا پلاٹ یعنی خلاصہ خرید کر پڑھا تھا۔ جس کے آخر میں لکھا تھا کہ باقی پردۂ سیمیں پر ملاحظہ کیجئے۔ اور یہ دس آنے والا بکرا اپنے شوق سے دیکھتا چاہتا ہے کہ باقی پردۂ سیمیں پر کیا ہوتا ہے۔ جب پردۂ سیمیں پر ایک بیٹا اپنے باپ کے منہ پر تھپڑ مارتا ہے تو یہ بکرا غصّہ سے میاں اٹھتا ہے۔ جب خاوند اپنی نیک بیوی کو گھر سے دھکے دے کر باہر نکال دیتا ہے تو یہ بکرا غصّے سے پاگل ہو جاتا ہے۔ جب ایک یتیم بچہ اپنی بیمار ماں کی دوائی لاتے ہوئے کسی سرمایہ دار کی موٹر کے نیچے آ کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ تو اس بکرے کا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جب ماں اپنے بچے کی قبر کو تلاش کرتے ہوئے قبرستان میں

ولین کرتے ہوئے دردناک گانا گاتی ہے۔ تو یہ بکرا دس آنے والی
کلاس میں بیٹھا رو رو کر بُرا حال کرلیتا ہے جب مسخرہ عین موقع پہ
جیب میں سے پستول نکال کر ولین کو ہینڈز اپ کروا دیتا ہے تو یہ
بکرا یا علی کا نعرہ بلند کرتا ہے لیکن جب آخر میں جاکر اسے معلوم ہوتا
ہے کہ کہانی میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اور اسے "الو بنایا گیا ہے۔ اور
ہیروئن کی شادی اسی کی یعنی بکرے کی مرضی کے خلاف کسی دوسرے
مرد سے کروا دی گئی ہے۔ تو وہ یا علی کا نعرہ لگا کر اٹھتا ہے اور دھڑا
دھڑ کرسیاں توڑنا شروع کردیتا ہے۔ پھر بھی یہ بکرا قابلِ رحم ہے کیونکہ
اس کی گردن پہ پوری کی پوری فلم انڈسٹری مل کر چھری چلاتی ہے۔
اور قربانی کے بعد اسکی بوٹی بوٹی بھی کسی کے حصے میں نہیں آتی۔ اس کا گوشت
نہایت لذیذ ہوتا ہے۔ اور فلم انڈسٹری میں بڑی رغبت سے کھایا جاتا ہے۔ اسکی کھال سے
ایکٹریس اپنی کمر کی پیٹیاں بنواتی ہیں اور پروڈیوسر وغیرہ چمڑے کے بڑے
بڑے بٹوے بنواتے ہیں۔ تاکہ ان میں کافی نوٹ بھر جا سکیں۔ فلم انڈسٹری کا
ہر آدمی اسکے لذیذ گوشت اور شاندار چمڑے کی آرزو کرتا ہے اور اسکی ٹکر سے
گھبراتا ہے۔ شیوجی مہاراج کی طرح جب تباہی پھیلانے پر آتا ہے تو دفتروں
کا بوریا بھی بکوا دیتا ہے۔ بیوقوف کو عقلمند اور گدھے کو ایک ہی دن میں اعلیٰ
نسل کا گھوڑا بنا دیتا ہے۔ فلم انڈسٹری میں اس بکرے کی پوجا بھی ہوتی ہے اور
قربانی بھی ہوتی ہے۔ قربانی اس شان سے ہوتی ہے کہ اسٹوڈیو کے قلی اور سنیما
کے گیٹ کیپر سے لیکر فنانسر اور سنیما کے مالکان تک میں اسکی تکا بوٹی تقسیم ہو جاتی ہے۔

. . . .

غافل ہوشیارپوری

غافل ہوشیارپوری شاعر ہے، غافل تخلص کرتا ہے لیکن غفلت اس سے دُور ہے۔ وہ بڑا ہوشیار ہے۔ ہوشیارپوری رعایت نہیں کرتا کیونکہ ہوشیارپور بڑا دماغ کا ضلع ہے اس کے اندر پل کے رہنے والا شاعر جاہل شاعر ہو سکتا ہے لیکن بدذوق اور ہوشیارپور نہیں ہو سکتا۔ غافل اگرچہ ہوشیارپوری ہے لیکن ذوق اور رومان اس کے قریب سے ہو کر بھی نہیں گزرے۔

شروع میں جب وہ لاہور میں وارد ہوا تو وہ ایک معمولی شاعر تھا جو صرف حمد باری تعالیٰ لکھ کر پیشہ ور نعت خوانوں کو دیا کرتا تھا۔ یہ نعت خواں غافل ہوشیارپوری کو میلاد کی محفل سے لائے ہوئے الائچی والے کٹے ہوئے پھلوں کے ٹکڑے اور بتاشے اس کی نعتوں کے معاوضے کے

طور پر ضیا کرتے تھے۔

یہاں غافل کا جی نہ لگا۔ اس کی طبیعت میں شروع سے کچھ کرنے اپنے سے گذر جانے دوسروں پر سے گذر جانے کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس نے ماحول میں چاروں طرف آنکھیں گھما کر دیکھا۔ غافل ہوشیار پوری نے محسوس کیا کہ مذہبی شاعری کی گنجائش نہیں، کیونکہ اس میدان میں وہ نعتوں سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ رومانی شاعری اس کے بس کا روگ نہیں صبح کی تازہ ہوا میں نکلنے سے زکام ہو جاتا ہے۔ بستر اوپر اٹھا کر چاند کو دیکھنے سے اسے چھینک آجاتی ہے۔ رومان تو یہیں ختم ہو گیا۔ غافل ہوشیار پوری اس نتیجے پر پہنچا اگر وہ ترقی پسند شاعری کرنی شروع کر دے تو وہ اپنے لئے ایک مقام بنا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے تانگے والوں، رکشا ڈرائیوروں، لاہور کے نانبائیوں، قلچہ فروشوں .... اور طوائفوں پر گھٹیا قسم کی نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔ چونکہ لوگوں کے جذبات میں ہیجان پیدا کر دینے والا موضوع تھا۔ اس لئے غافل ہوشیار پوری کی نظموں کا لوگوں نے بڑے جوش کے ساتھ خیر مقدم کیا۔

اب غافل ہوشیار پوری کے آگے بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ کیونکہ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اس کی شاعری کے ڈانڈے اس سرحد تک چلے جائیں — لوگوں کو ساحر لدھیانوی کا خیال آجائے۔ تو اس نے بڑی ہوشیاری اور مکاری کے ساتھ اپنی نظموں کے ذریعے لوگوں کی توجہ ہٹائی۔ کوچوان اور لاہور کے اندرون علاقے کے موچیوں، گرم حمام والوں، دھوبیوں،

طوائفوں اور چرس بیچنے والوں سے آگے نہ بڑھنے دی۔ غافل ہوشیار پوری ساحر لدھیانوی کی طرح تاج محل پہ نظم نہ لکھ سکتا تھا لیکن اس نے اتنی کامیابی ضرور حاصل کرلی کہ لوگوں کی توجہ تاج محل کی طرف آنے ہی نہیں دی اور اسے لاہور کے اندر تنوروں اور گرم حماموں کے چکروں میں ہی الجھائے رکھا۔

اس قسم کی گھٹیا اور سستی شہرت حاصل کرنے کے بعد غافل ہوشیار پوری ایک اخبار کے ساتھ منسلک ہو گیا لیکن طبیعت کی ہوشیاری اور مزاج کی مکاری نے اسے یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ہوتے ہوتے وہ فلمی دنیا میں نکل آیا لیکن فلمی دنیا میں شاعری کا مقابلہ سخت تھا کیونکہ یہاں گرم حمام والوں، نانبائیوں، موچیوں اور دیگیں پکانے والوں پہ نظمیں لکھنے والوں کا کوئی چانس نہیں تھا۔

اب غافل ہوشیار پوری نے سر پہ ہاتھ رکھ کر سوچا کہ کیا کیا جائے۔

مکالمہ۔۔!

مکالمہ۔۔!

کہانی۔۔!

بالکل ٹھیک ہے مکالمہ اور کہانی بالکل ٹھیک ہے مجھے کہانی اور مکالمے لکھنے چاہئیں۔ پاکستان میں میری ایسی کہانی اور مکالمے لکھنے والا کوئی نہیں، آج تک کسی نے دلیے کی دیگیں پکانے والوں اور لاہور کے گرم حمام والوں پہ کوئی کہانی نہیں لکھی۔ کوئی ایسا مکالمہ نہیں لکھا جو سننے

والے کو ایسے چکروں میں الجھادے۔ جس سے وہ کبھی باہر نہ نکل سکیں۔

چنانچہ غافل ہوشیارپوری مکاری سازشی طینت اور دوست کش ذہنیت بروئے کار لایا۔ اس نے فلمی دُنیا میں داخل ہونے کے بعد جھنڈے کو ہاتھ میں پکڑا۔ کچھ لوگوں کو دوست بنایا، پھر انہیں مار گرایا۔ انکی لاشوں پر سے گذر کر آگے بڑھا۔ ایک شخص کو باپ بنایا پھر اسے اپنا ناعاق بیٹا کہا۔ پھر اسے حرامی بچہ کہا۔ پھر اسے پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھا پہلے وہ فاقے کرتا تھا۔ فاقہ کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ فاقہ ہر ایک کو آسکتا ہے اگر پیسنوزا اور شوپنہار اس دور میں ہوتے تو نا قہ انہیں بھی آجاتا۔ چنانچہ غافل ہوشیار پوری نے بھی فاقے کئے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شوپنہار فاقے کے بعد اپنے محسن کو یاد رکھتا لیکن غافل ہوشیارپوری کو جس نے فاقے کے بعد کھانا کھلایا اس نے اسی کے گھر میں ڈاکہ ڈالا اسی کے پیٹ میں چھرا گھونپا اور ترقی کرنی شروع کردی۔ یہ ایک قاعدہ ہے کہ نیچر ایسے لوگوں کے مخالف ہوتی ہے۔ لیکن معاشرہ ان کے موافق ہوتا ہے چنانچہ ایسے لوگ معاشرہ کے ساتھ ترقی کرتے جاتے ہیں اور نیچر کے اعتبار سے رو بہ تنزل ہوتے ہیں ایک دن ایسا آجاتا ہے کہ وہ معاشرتی اعتبار سے اعلیٰ درجے پر کھڑے ہوتے ہیں لیکن نیچر انہیں قرار دے چکی ہوتی ہے اور جسم کے ساتھ ساتھ اس کی روح کا بھی فاتحہ پڑھ رہی ہوتی ہے۔

چنانچہ غافل ہوشیارپوری فلمی صنعت میں ترقی کرنے لگا لیکن اس کا ضمیر جو پہلے ہی مردہ تھا۔ اب اپنے اجزا سے دست بردار ہوتے، اور

کپڑوں کی چوراک پہننے لگتا۔

غافل ہوشیار پوری جس فلمی لوٹ میں جاتا ہے پہلے وہاں پر دیکھتا کہ فلم پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کے آس پاس کیسے لوگ ہیں۔ با اثر لوگوں کے ساتھ وہ خود مل جاتا اور بے اثر لوگوں کا وہ قلع قمع کر دیتا۔ دوسرے اُس نے دس آنے والی کلاس کے لوگوں کی نبض پہ ہاتھ رکھ دیا اور ان کی کمزور رگ ڈھونڈلی چونکہ ساری فلم انڈسٹری دس آنے کلاس پہ منحصر ہے اور اسی پہ اکتفا کرتی ہے اسی کی وجہ سے زندہ ہے اور ایک دن اسی کی وجہ سے مر جائے گی۔ اس لئے غافل ہوشیار پوری کو بڑی کامیابی نصیب ہوئی۔ غافل ہوشیار پوری نے پروڈیوسر کے قدم چومے اور کامیابی غافل ہوشیار پوری کے قدم چومنے لگی۔ غافل ہوشیار پوری نے مکالموں میں ایک خاص صنعت ایجاد کی، یعنی اصل بات کو چھپا کر اِدھر اُدھر سے گھما کر پیش کرنے کا انوکھا طریقہ۔

بجائے سیدھے ہاتھ سے منہ میں نوالہ ڈالنے کے گھما کر گردن کے پیچھے سے نوالہ ڈالنے کی تکنیک۔ چونکہ عام طور پہ لوگ سیدھی بات کو سیدھے منہ نہیں سنتے۔ اس لئے لوگوں نے غافل ہوشیار پوری کو خوب داد دی۔ ویسے بھی یہ ایک قاعدہ ہے کہ عوام ہمیشہ ان لیڈروں کے پیچھے جان دیتے ہیں۔ جو ہمیشہ ان کی جان لینے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ غافل ہوشیار پوری کامیاب ہو گیا۔ اس کے مکالمے امرتسر کے مرحوم احراری لیڈروں کی تقریروں کی طرح تھے۔ جو ایک ہی رات کے جلسے میں برسوں کے گھر

مسلم لیگیوں کو اپنی حمایت میں کر لیتے تھے لیکن صرف ایک رات کے لئے۔
رات کو آدمی احراری ہو جاتا، اور صبح کو پھر لیگی ہو جاتا تھا۔

غافل ہوشیار پوری کے دردناک مکالمے سن کر لوگ سینما ہال میں بیٹھ کر
آنسو بہاتے اور باہر نکل کر حیران ہوتے۔ کہ انہوں نے کس بات پر اپنی
آنکھوں کا پانی ضائع کیا۔ ان کے مکالمے عام طور پر اس قسم کے ہوتے ذیل
میں چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اصل بات یہ ہے کہ باپ سے بیٹا یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں اسکی پسند
کی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔ اب غافل ہوشیار پوری کا مکالمہ
ملاحظہ ہو۔

باپ :۔ تم کو یہ شادی کرنی پڑے گی۔ تو میرے چراغ کی کرن ہو
اور سورج کی روشنی سے بغاوت نہیں کر سکتے۔

بیٹا : میں بغاوت کا پیشی امام ہوں میں ۱۹۴۸ء میں پیدا ہوا تھا۔
میں اپنی قبر پر اپنے باپ کا کتبہ نہیں لگانا چاہتا۔ میں سینے پر اپنے باپ کے
زخم نہیں کھانا چاہتا۔ میں اپنی زبان میں اپنے باپ کی جوتیاں نہیں چھپانا چاہتا۔
میں آزاد ہوں عشق میں اور ستاروں میں اور ستاروں میں لوگ سینما ہال میں تالیاں
پیٹتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی سمجھ میں اصل بات تو نہیں آتی۔ لیکن اس کی نقل
ضرور سامنے آجاتی ہے یعنی بھانڈوں ایسی نقل اب دوسری مثال ملاحظہ ہو۔

اصلی مکالمہ :۔
میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ غافل ہوشیار پوری کا مکالمہ۔

ہیرو :- تم آسمان کی چراگاہ میں کھلا ہوا پھول ہو۔ تم فطرت کے پاجامے کا ازار بند ہو جو تم نہیں ہو۔ تم اس لیے نہیں ہو کیوں کہ تم وہ ہو، تمہارا حسن رات کی چاندنی ہے، اور میں اس چاندنی میں پاگلوں کی طرح پھرنے والا گیدڑ ہوں میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ آہ یہ میں کیا کہہ گیا۔

مثال نمبر ۲ :-

اصل سین - ایک آدمی زخمی حالت میں اندر آتا ہے۔ ہیرو اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اب چاہیئے یہ کہ وہ اسے کہے کہ بیٹھ جاؤ۔ اس کے بعد فوراً اس کے زخموں پہ پٹی باندھنا شروع کر دے لیکن غافل ہوشیار پوری ایسا اناڑی آدمی نہیں۔ اس کا مکالمہ ملاحظہ ہو۔

زخمی اندر آتا ہے۔ ہیرو اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

ہیرو۔ (قہقہہ لگا کر) تم کمینے ہو اپنی ڈھال پہ میرے تیروں کے نشان لے کر آ گئے ہو۔ اپنے تنور میں میرے تلیجے لے کر آ گئے ہو۔ اپنے ڈربے میں میری مرغیاں بند کر کے آ گئے ہو۔ اپنے مکان میں میرے کرایہ داروں کو قید کر کے یہاں کیا لینے آتے ہو۔ ہا ہا ہا۔! میں اس بہتے ہوئے خون میں اپنے مکان کے پرنالے کو دیکھ رہا ہوں میں اس اپنے مکان کی کھڑکی میں کسی دوسرے کا سر دیکھ رہا ہوں۔ میں اس سر کو قلم کر دوں گا لیکن میں اپنے دشمن سے بھی دوستی سے پیش آؤں گا، کیونکہ میں بہادر ہوں۔ اور لوہا لوہے کے ساتھ لوہے کی طرح ملتا ہے، موم کی طرح نہیں (آواز دے کر)

عمود ! میرے دوست کے زخموں کے لئے پٹیاں لائی جائیں۔ لوگ تالیاں بجاتے ہیں، اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ اور باہر آکر سوچتے ہیں کہ انہیں بیوقوف تو نہیں بنایا گیا۔

لیکن غافل ہوشیارپوری کامیاب ہے۔ کیوں کہ شہ لوگوں کو بے وقوف بنا سکتا ہے۔ وہ اصل بات چھپا جاتا ہے۔ اس لئے بہترین نقال ہے۔

. . . .

انارکلی میں ایک اتوار

نظام سقے نے ہمایوں سے ایک دن کی بادشاہت لے کر سکہ چلا دیا تھا۔ انارکلی کے بازار میں اتوار کو عارضی دکانیں سجانے والے اپنا سکہ تو نہیں چلا سکے لیکن انہوں نے ایک دن کی بادشاہت ضرور حاصل کر لی ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ یہ بادشاہ لوگ جلا وطنوں ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ لوگ روزگاروں کے جزیروں میں جلا وطن ہیں۔

اتوار کو بہ خانہ بدوش دکاندار دوسری دکانوں کو بند پاکر ان کے باہر اپنا بوریا بستر بچھا کر اپنی عارضی دکانیں سجا دیتے ہیں۔ چونکہ یہ ہفتے میں چھ دن ناغہ کرتے ہیں۔ اس لئے انہیں صرف اپنی عارضی دکان پہ صرف ایک تختی پہ ہی لکھنا ہوتا ہے کہ۔

"آج ناغہ نہیں ہوگا۔"

یہ بزرگ جو اپنی دکان سجا کر قیلولہ کر رہے ہیں۔ لکھنؤ کے قریب ہردوئی کے رہنے والے ہیں۔ سو پشت سے پیشہ عطر فروشی ہے، خود بھی عطر کی ایک پھریری ہیں، مگر زمانے کی ہوا خوشبو اڑا کر لے گئی ہے۔ اب نہ امنگ ہے نہ باس۔

جوتوں کی دکان کی سیڑھیوں پر عطر کی دکان لگا کر خود آرام کر رہے ہیں۔

بہت تھک گئے ہیں۔ پاؤں نے ہردوئی سے لاہور تک کا فاصلہ پیدل طے کیا ہے۔ کندھوں نے گیارہ سال تک نصف درجن بچوں کا بوجھ اٹھایا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر آملہ کے تیل کی بوتل کو ہاتھ لگایا تو اٹھ بیٹھے۔

"کیا چاہیئے میاں۔؟"

"گوالیار کی اگر بتیاں ہیں میاں۔؟"

"گوالیار اب کہاں میاں —

کراچی کا مال کیوں نہیں لیتے۔؟ یہ لو — ست خیاب اگر بتی ذرا سلگاؤ، اگر ہوش ٹھکانے نہ آجائیں تو دام واپس۔ کراچی تو گوالیار سے بازی لے گیا بھائی۔

آپ ہر اتوار کو یہاں ہوتے ہیں میاں۔

ہاں جی یہ تو اپنی پرمننٹ دکان ہے۔

لانڈری کے تھڑے پر ایک صاحب الیکٹرک سلیوشن فروخت کر رہے تھے۔

دری پر چینی کے ٹوٹے ہوئے کچھ جڑے ہوئے برتن پڑے تھے۔ میرے استفسار پر انہوں نے ایک نپے تلے انداز میں سلائی اٹھائی اور یوں بولتے چلے گئے جیسے خراد کی مشین چل رہی ہو۔ ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ یوں گونج رہے تھے جس طرح مشین کے منہ سے برادہ گرتا ہے۔

ایک سلائی لے کر اس پر روئی چپکا ئیں الیکٹرک سلیوشن کی شیشی میں ڈالیں۔ ٹوٹے ہوئے برتن کو بائیں ہاتھ میں لے کر اس کے کناروں پر سلیوشن لگائیں پھر دوسرا ٹکڑا چپکا کر آہستہ سے ہاتھ پھیر دیں۔ ہاں اسے گرم نہ کریں، پھر زمین پر پھینک دیں۔ برتن دوسری جگہ سے ٹوٹے گا مجال جو جڑی ہوئی لکیر آنکھ بھی کھول جائے۔ سر میں درد ہو تو ماتھے پر لگا کر انگوٹھے سے دبائیں۔

ہاں۔ گرم نہ کریں —— دانت میں درد ہو تو ہتھیلی پر رکھ کر بائیں ہاتھ سے مسوڑھوں پر مالش کریں۔ مرچیں ضرور لگیں گی، مگر درد غائب ہوگا۔ یہ انارکلی ہے۔ ہر اتوار کو یہاں بیٹھتا ہوں۔ آزمائش شرط ہے، ہاں گرم نہ کریں۔

ایک بڑی ماڈرن عیادری کی دوکان کے باہر ایک صاحب نے

غباری کی دکان سجا رکھی تھی ۔ انہوں نے بڑی کاریگری سے نیند دکان کا ایک خوبصورت شوکیس اپنی عارضی دکان میں شامل کر رکھا تھا۔ میں نے پوچھا۔

" آپ شوکیس کا کرایہ ادا کرتے ہیں ۔؟ "

وہ بولے ۔

" کرایہ کون چھوڑتا ہے۔ بھائی نہ مالک مکان، نہ زمین نہ آسمان۔ کوئی کسی کو نہیں چھوڑتا، وہ زمانہ آگیا ہے کہ بھائی بھائی کی گردن دبا رہا ہے۔ "

میں نے کہا۔

" اس شوکیس نے تو آپ کی دکان سجا دی ہے "

" جناب عالی ! یہ دکان صرف اس خاکسار کی وجہ سے سج رہی ہے دوکان کی وجہ سے شوکیس سج رہا ہے۔ ذرا دوسرے شوکیس بھی دیکھیں۔ کیا ویرانی برس رہی ہے۔

آپ ہفتے کے دوسرے دن کام کرتے ہیں، گھوم پھر کر سرخی پاؤڈر بیچتے ہیں۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔ مچھر دانیاں بیچنے والے نے باٹا کی دکان پر قبضہ جما رکھا تھا، اور چھولداری نما غالی مچھر دانیاں وہ دکان کے لکشن

دانوں تک چڑھا رکھی تھیں خود ان کے درمیان بیٹھا جاسوسی کہانیاں پڑھ رہا تھا مجھے یقین ہے کہ وہ رات کو مچھر دانی کے بغیر سوتا ہوگا۔
کہنے لگا۔

اجی مچھر تو پیسے والوں کو کاٹتا ہے بابو جی۔
پیسے والوں کو بہت سی چیزیں کاٹتی رہتی ہیں۔ غریب آدمی آرام سے سوتا ہے۔

زنانہ بنیانیں اور انگیاں پہاندے بیچنے والا ہفتے کے باقی دنوں میں لنڈے میں گھوم پھر کر مردوں کے لئے دھوتیاں اور لنگوٹے بیچا کرتا ہے۔ اس کی دکان پہ نیم دیہاتی عورتوں کا ہجوم تھا۔ کچھ جھجک جھجک کر انگیاں اٹھاتیں اور پیسے دے کر اُسے تھیلے میں ڈال کر آگے چل پڑتیں۔ دکاندار کہنے لگا۔
" دیہاتی عورتیں شرمیلی ہوتی ہیں۔ شہری عورتیں تو انگیا کا سائز بتا کر اُسے اچھی طرح سے دبا کر بھی دیکھتی ہیں۔ اور پھر ایک ایک پائی کے لیے بھی جھگڑتی ہیں۔"
اتوار کو انارکلی میں فیشن ایبل عورتیں کہیں بھی دکھائی نہیں دیتیں۔ مرد گاہکوں کی تعداد بھی زیادہ تر جیبوں پر مشتمل ہوتی ہے۔
" یہ فوجی بڑے اچھے گاہک ہوتے ہیں۔ قیمت پر ذرا جھگڑا نہیں کرتے۔ حالانکہ ان کا کام ہی لڑنا ہوتا ہے۔
یہ بات مجھے ایک کشمیری خواجہ امرتسری نے بتائی تھی۔ خواجہ

صاحب کپڑے کی ایک بند دکان کے چبوترے پر دریاں، کھیلے، گیند، بلّے اور بچّوں کے کھلونے بیچتے ہیں۔

" امرتسر میں جی اپنا پیشمینے کا کام تھا۔ ہزاروں کا مال ہاتھ سے نکلتا تھا۔ یہ موج میلا صرف اتوار کو لگاتا ہوں۔ باقی دن گھر بیٹھ کر رفوگری کرتا ہوں۔"

" آپ اس کام سے خوش ہیں کیا۔ ؟"

" خدا کا ہر حال میں شکر ہے باؤ جی۔ روٹی مل جاتی ہے۔ آدمی کے پاس باؤ جی یا تو زر ہو۔ اور یا اولاد لائق ہو۔ لیکن جی زر بھی مصیبت ہے۔ اولاد لائق ہو تو اپنے کام آئے گی ہمیں کیا دے گی۔ بس جی ہم تو یہ جانتے ہیں کہ آدمی کو ہر حال میں خوش رہنا چاہیئے۔ کہیئے کوئی تھیلا دکھاؤں۔ ؟"

لیکن میں وہاں سے جا چکا تھا۔ اور اب ایک لمبی چوڑی دکان کے بند دروازے پر لٹکے ہوئے کیلنڈروں کو دیکھ رہا تھا۔ ہر قسم کی تصویریں موجود تھیں۔ علامہ اقبال کی تصویر والے کیلنڈر کے ساتھ مسرت نذیر کا کیلنڈر تھا۔

" شانِ اسلام " کے نام پہ اتاترک کی تصویر تھی۔ ساتھ ہی سبزیوں کا چارٹ لگا تھا۔ ایک کیلنڈر میں جاپانی لڑکیاں جانگیے پہنے حوض کے کنارے کھڑی تھیں دوسری جگہ نیم برہنہ اطالوی عورتیں ساحل پہ چت لیٹی غسل آفتاب کر رہی تھیں۔ لوگوں کی ایک

.....ٹولی وہاں کھڑی ان عورتوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھیں۔

یہاں حقیقتاً نظارے کو جنبش مژگاں بھی بار تھی۔ میرے کانوں میں الیکٹرک سلوشن والے کا جملہ گونج رہا تھا۔

" سلوشن لگا کر اس پہ ہاتھ پھیریں، مگر ہاں اُسے گرم نہ کریں "

" آپ تو خواہ مخواہ گرم ہو رہے ہیں۔ جی

گاہک کی بات سُن کر پتا لالہ جی دکان کے تختے پہ جڑی ہوئی سلیم شاہی جوتیوں کا جوڑا اتارتے ہوئے ٹھٹھک گیا۔

" میں آپ کو سلیم شاہی دکھا رہا ہوں "

" آپ مجھے سکھا شاہی دکھا رہے ہیں۔ بارہ روپے تین آنے سے اگر کوئی مائی کا لال کم لے لے تو یہ سلیم شاہی اور میرا سر "

لیکن گاہک اپنا سر بچا کر وہاں سے رفوچکر ہو چکا تھا۔ دکاندار بکھری پڑی جوتیوں کو اِدھر اُدھر سے اٹھا کر ٹوکری میں ڈالنے لگا۔ جیسے وہ کبوتر تھیں اور انہیں ڈربے میں بند کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں ابھی تک سلوشن والے کی آواز گونج رہی تھی۔

" پاٹیں — پاٹ کر لگائیں — لگا کر سکھائیں۔ مگر ہاں ... ذرا گرم نہ کریں۔ "

" لیکن بھائی! پکوڑے گرما گرم ہی مزا دیتے ہیں۔ اتنا کہہ کر کتابوں والی دکان کے باہر بیٹھے ہوئے پکوڑے فروش نے

کڑاہی میں سے تازہ مال نکال کر تھالی میں لگا دیا۔

دوسری دکان کی سیڑھیوں پر جنسی۔ جاسوسی۔ تاریخی۔ معاشرتی اور مذہبی کتابیں ٹوکروں میں بھری پڑی تھیں۔

دکاندار ایک ہاتھ میں اسلامی ناول کھولے اسے پڑھ رہا تھا، اور دوسرے ہاتھ سے پنکھے کی ڈنڈی بنیان کے اندر ڈال کر پیٹھ کھجلا رہا تھا۔ کھجلی کی لذت اندر ہاتھوں کی حرکت کے فعل سے اسکے جبڑے کانوں کی طرف کھنچ گئے تھے۔ وہ ساتھ ہی ساتھ پیچ و تاب بھی کھائے جا رہا تھا۔ شاہ پڑھ رہا تھا۔

فدایانِ اسلام! نعرۂ تکبیر کی للکار کے سامنے کفار کے لشکر کا بکھر جانا ایک خیال خام اور خیال باطل ہے۔

" تمہاری تلواروں سے ٹپکنے والا خون اسلامی تاریخ میں تمہارے نام سنہری حروف میں لکھے گا۔ اللہ اکبر"

دکاندار نے جوش میں آکر پنکھے کی ڈنڈی بنیان کے اندر توڑ دی۔ اتنے میں ایک گاہک نے آکر پوچھا۔

" کیوں جی۔ جنگلی دوشیزہ ناول ہے گیا؟"

دکاندار نے اسلامی ناول نیچے رکھ کر گاہک کو "جنگلی دوشیزہ" حوالے کی، پیسے لئے اور اب ایک جنسی ناول کھول کر پڑھنے لگا۔

آہ فریدہ! تمہاری گردن کے بال۔ تمہارے سینے کے مندروں کے کلس اور تمہاری پیٹھ پر بل کھاتی یہ بالوں کی ناگن اُف! میرا سر گھوما جا رہا ہے......

اب کے دکاندار دوسرے پنکھے کی ڈنڈی سے ٹانگیں کھجلا رہا تھا۔

. . . .

کچھ فلمی مناظر
جو فلمائے نہ جاسکے

قربانی کا منظر

عاشق :- پیاری سلطانہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں تو میری زندگی کا ڈیرہ بابا نانک ہے۔ تو میری پستول کی گولی ہے جب سے تجھے دیکھا ہے اندھا ہوگیا ہوں۔ تو میری تندگوبی ہے میرے گرم حمام کی ٹونٹی ہے۔ میری محبت کی بس کا سٹیشن ہے میرا چپلی کباب ہے۔

معشوقہ :- کیا کہا مُردار ذرا پھر تو کہنا۔

عاشق :- آہ! پھر کہوں؟ کیسے کہوں؟ کس کو کہوں؟ حال دل نہیں سنتا کوئی۔ ظالم کتاب عشق کے ہر ورق پہ تیرا نام سلطانہ ڈاکو بن کر زندہ رہے گا۔ تو نے بغدادی چور بن کر میرے دل کی دنیا لوٹ لی ہے۔ میں تجھ سے ہی نہیں

تیری ماں اور تیرے باپ سے بھی عشق کرنے لگا ہوں۔
معشوقہ:۔ شرم کر شرم اد پاپی۔ تو جیسے اپنی زبان فاسد کلام سے معشوقہ کہہ کر پکار رہا ہے۔ وہ ایک پیا ہتا استری ہے۔ وہ ایک شوہر کی بیوی اور ایک بچے کی ماں اور ایک بھائی کی بہن ہے تو جس کلی کو اپنے دست ظلم سے نوچ کر پھینک رہا ہے۔ وہ ایک بدنصیب باپ کی غریبی کی نشانی ہے۔ ایک ستم رسیدہ ماں کی عزت کا ہیرا ہے (ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف مُنہ اٹھا کر) آہ! اے فلک کج رفتار اے آسمان والے تو خاموش کیوں ہے۔ ایک مظلوم کی فریادرسی کو کیوں نہیں پہنچتا۔
عاشق:۔ (ٹوپی اُتار کر زمین پر پھینکتے ہوئے) آہ ... سلطانہ بی بی میں گنا ہوں۔ میری گردن پر سوار ہو کر میرا جبڑا چیر دے میں نے ایک ستی ساوتری کو بُری نظر سے دیکھا۔ سلطانہ بی بی آج سے تو میری بہن ہے۔ اور میں تیرا بھائی ہوں۔ آج سے دُنیا دیکھے گی، کہ ایک بھائی بہن کی خاطر کس طرح جان قربان کرتا ہے۔ آہ! میری آنکھو! تم نے سب سے پہلے یہ گناہ کیا تم نے ہی سب سے پہلے مجھے اِس گناہ کی طرف مائل کیا ہیں تم کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ (جیب سے سلائی نکال کر اپنی آنکھیں پھوڑ لیتا ہے۔)
معشوقہ:۔ آہ! پیارے بھائی یہ تو نے کیا کر دیا۔

عاشق :۔ بس میری بہن میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ میں اب تیرا بھائی ہی نہیں، بلکہ سورداس ہی ہوں۔ سورداس بھگت سورداس۔

معشوقہ :۔ پیارے سور! میں تم سے مذاق کر رہی تھی۔ میں تو تیرا امتحان لے رہی تھی۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ ہائے یہ تم نے کیا ظلم کر دیا۔ اب میں کیا کروں۔

عاشق :۔ پیاری بہن! اب مجھے عاشق کہہ کر میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کرو۔ پانی سر سے گزر گیا ہے۔ میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میں اب کپڑے پھاڑ کر جنگل کی طرف جاتا ہوں۔ اور بھگوان کی بھگتی کرتا ہوں۔

(عاشق کپڑے پھاڑ کر سورداس کا بھجن گاتا جنگل کی طرف چل پڑتا ہے)

باپ بیٹے کا منظر

بیٹا :۔ پاؤں پر گر کر! ابا حضور!

باپ :۔ (ٹھکرا کر) بس نابکار! خبردار جو میرے پاؤں چھوئے ہیں تجھ ایسے نافرمانبردار کو ایک پل کے لئے بھی اپنے گھر میں نہیں دیکھ سکتا۔

بیٹا :۔ ابا حضور معاف کر دیجئے۔

باپ :۔ بکواس بند کرو۔

بیٹا :۔ بند کرتا ہوں۔

باپ :۔ تجھے لیلیٰ کو بھلا کر نجمہ سے شادی کرنا ہوگی۔

بیٹا :۔ ابا حضور! نجمہ سے آپ شادی کر لیجئے۔

باپ :۔ بکواس بند کر۔ میں تیرا باپ ہوں نجمہ کا عاشق نہیں

بیٹا :۔ تو پھر میری بات بھی غور سے سن لیجئے میں بھی لیلیٰ
کا عاشق ہوں۔ آپ کا نہیں۔ لیلیٰ سے بیاہ کر رہا ہوں۔
آپ سے نہیں۔

باپ :۔ میں تجھے جائیداد سے عاق کر دوں گا۔

بیٹا :۔ پرواہ نہیں۔

باپ :۔ میں تجھے گھر سے نکال دوں گا۔

بیٹا :۔ فکر نہیں۔"

باپ :۔ میں تجھے حوالات بھجوا دوں گا۔

بیٹا :۔ دیکھا جائے گا۔

باپ :۔ میں تیری ماں کو طلاق دے دوں گا۔

بیٹا :۔ آپ کی مرضی۔

باپ :۔ میں زہر کھا لوں گا۔

بیٹا :۔ میری بلا سے۔

باپ :۔ (بیٹے کے پاؤں پہ گر کر) معاف کر دو پسر عزیز میری

خطا معاف کردو۔ مجھ سے سخت غلطی ہو گئی۔ تو شوق سے لیلیٰ کو بیاہ لا۔
میں کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔

بیٹا :۔ ہا ہا ہا۔ اب آیا راہ راست پر نا ہنجار بڑا باپ بنا پھرتا تھا۔ ایک ہی مکالمے سے گھگھی بند ہو گئی۔ ابھی تو میں نے ڈرامے کے مکالمے بولے ہی تھے۔

باپ :۔ مگر بیٹا حضور! ایک بات کا خیال رہے کبھی کبھی بخمہ سے بھی ملتے رہنا اور اُسے گھر بلاتے رہنا۔

بیٹا :۔ کیوں۔ ؟

باپ :۔ (شرما کر) بڑے بھولے ہو تم بھی۔

بیٹا :۔ (قہقہہ لگا کر) او سمجھ گیا۔ سمجھ گیا۔ فکر نہ کرو پیارے ابا۔ بخمہ ہر ہفتے کی شام یہاں گذارا کرے گی۔

(باپ بیٹے کا ہاتھ چوم کر آنکھ مارتا ہے)

محبت کا منظر

ہیرو :۔ آہ! آسمان پر چمکتا ہوا یہ بناوٹی چاند۔ یہ لکڑی کے تختوں پر اکڑوں بیٹھے ہوئے بندر روں ایسے لائٹ مین یہ سٹوڈیو کی گھاس پھوس والی بوسیدہ تاروں بھری چھت۔ یہ ہمارے آس پاس کھلے ہوئے کاغذ کے پھول۔ یہ قریب بیٹھا

ہے۔ اگدھا ڈائریکٹر، یہ اس کے پاس کھڑا ہوا پروڈیوسر جس کے ذمے تقدرے اور بیرے پورے دو صد روپے بھی واجب الادا ہیں۔ یہ سارا منظر کتنا دلفریب ہے۔

ھیروئن:۔ اخاہ! پیارے تم نے کتنی میٹھی باتیں کی ہیں! لیکن پیارے تم اس بوڑھی عورت کو بھول گئے ہو۔ جو سامنے کرسی پہ بیٹھی سویٹر بننے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ جو در اصل میری ماں ہے لیکن لوگوں میں میری بڑی بہن کے نام سے مشہور ہے۔ بظاہر وہ سلائیاں چلا رہی ہے لیکن کافی آنکھ سے ہمیں دیکھ رہی ہے۔ کہ کہیں ہم ایک دوسرے کے ساتھ سچ مچ تو بغل گیر نہیں ہو رہے۔ آہ یہ سارا منظر کتنا دلکش ہے

ھیرو:۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) پیاری کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ سیٹ سے فارغ ہو کر تم سٹوڈیو کے عقب والے باغ میں مجھ سے ملو۔

ھیروئن:۔ پیارے میری ماں عقاب کی آنکھیں رکھتی ہے۔

ھیرو:۔ پیاری پھر کیا ہوا۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ تم ایک پل کے لئے آجانا، محبت کی کہانی لمبی نہیں ہوتی۔

ھیروئن:۔ پیارے! تم کہیں میرے ناموس پہ حملہ آور تو نہیں ہوگے۔

ھیرو:۔ (نعرہ مار کر) قسم ہے۔ پروردگار کی قسم ہے مجھے اپنی

تلوار کی، قسم ہے تمہاری میٹھی گفتار اور تمہاری ریشمی شلوار کی۔ میں تمہارے ناموس کو اپنا ناموس سمجھتا ہوں۔

ھیروئن :۔ بس مجھے اعتبار آگیا۔ میں فرولسین ختم کرنے کے بعد وہاں آؤں گی۔ لیکن ذرا دیکھو یہ ڈائریکٹر ہمیں گہری نظروں سے گھور رہا ہے کہیں اس پہ ہمارے عشق کا راز فاش تو نہیں ہو گیا۔؟

ھیرو :۔ اس کا فلک بھی ہمارے دل کی بات نہیں جان سکتا تم چپکے سے اس کا پارٹ ادا کئے جاؤ۔ ہاں وہ کیا مکالمہ تھا۔

ھیروئن :۔ پیارے! پیار کی اس خوبصورت شام کو جب دو دل گلے مل رہے ہوں اور جذبات مچل رہے ہوں کیوں نہ ایک دوگانا گایا جائے۔

ھیرو :۔ شوق سے۔ بسم اللہ کرو۔

ھیروئن :۔ بسم اللہ!

...... (ڈوئیٹ شروع ہو جاتا ہے۔)

ھیروئن : گھاس کے پاس کھڑے ہو کیوں ؟

ھیرو :۔ دگھا کر، گھسیارا ہوں۔

ھیروئن :۔ کار کے پاس کھڑے ہو کیوں ؟

ھیرو :۔ بےکارہ ہوں۔

ھیروئن :۔ ناک پہ ہاتھ دھرا ہے کیوں ؟

ھیرو :۔ ناکارہ ہوں۔ آوارہ ہوں۔

میک اَپ روم میں

ہیروئن :۔ ماسٹر جی آپ کا میک اَپ مجھے بالکل پسند نہیں۔

ماسٹر جی :۔ میڈم، میں کیا کروں۔ آپ کی آنکھوں کے نیچے اب حلقے اتنے گہرے ہو گئے ہیں کہ دنیا بھر کے پاؤڈر کے ڈبے بھی مل کر انہیں بھر سکتے۔

ہیروئن :۔ پھر کیا ہو ؟

ماسٹر جی :۔ انہیں تو اب شاہ عالمی کا ملبہ ہی بھر سکتا ہے۔

ہیروئن :۔ لیکن میں ابھی جوان رہنا چاہتی ہوں۔

ماسٹر جی :۔ مگر آپ کے گالوں پہ جھرّیوں کی جو لکیریں پڑ جاتی ہیں۔ ان کا کیا کروں، انہیں کیسے مٹاؤں۔ یہ تو پتھر کی لکیریں ہیں میڈم، اور پھر آپ کی گردن کی رگیں سائیکل کے ٹیوب کی طرح پھولی ہوئی ہیں۔ ٹھوڑی کے نیچے گوشت ڈھلک گیا ہے۔ اس ڈھلکے ہوئے گوشت کو میں کس پاؤڈر سے چھپاؤں اس کا تو ایک ہی علاج ہے کہ اسے ٹھوڑی پر کیل ٹھوک کر لٹکا دوں۔

ہیروئن :۔ بکواس بند کرو۔ ماسٹر جی اور مجھے زیادہ سے زیادہ خوبصورت بنانے کی کوشش کرو۔

ماسٹر جی :۔ میں تو پوری کوشش کر رہا ہوں۔ مگر آپ ذرا اپنی عمر بھی تو دیکھیے۔ خیر سے چالیسواں سال گذر رہا ہے اگر آپ

باقاعدہ بچے پیدا کر رہی ہوتیں تو اس وقت آپ کی پوتیاں
کالج میں پڑھنے جایا کرتیں۔ میرے ابھی داڑھی اُگی ہی
تھی۔ جب سے آپ کو ہیروئن کے رول میں دیکھ رہا ہوں۔
میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ آپ کیسے جوان رہ سکتی ہیں۔
ہیروئن :۔ ماسٹر جی خدا کے لئے میرے زخموں پہ نمک
پاشی نہ کریں میں جوان رہنا چاہتی ہوں۔ آپ میری آنکھ کے
کے حلقے چھپایئے۔ میرے گالوں کی جھریاں مٹایئے۔ میری
گردن کی پھولی ہوئی رگوں پہ پاؤڈر کا لیپ کیجئے۔ میری
ٹھوڑی کا ڈھلکا ہوا گوشت چھپایئے، خدا کے لئے کچھ کیجئے۔
نہیں تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔
ماسٹر جی :۔ میں کوشش کرتا ہوں لیکن میڈم میں ٹوٹا ہوا
بال چھپا سکتا ہوں۔ آپ کی گردن اور ہاتھوں کی پھولی
ہوئی رگیں نہیں چھپا سکتا۔ میں نوکری سے استعفیٰ دے سکتا
ہوں۔ مگر آپ کو کھوئی ہوئی جوانی نہیں دے سکتا۔
اپنی آنکھیں بند کر سکتا ہوں۔ لوگوں کی آنکھوں میں دھول
نہیں جھونک سکتا، شدہ ایک نہ ایک دن آپ کا بوڑھا
بدوضع بھدا بوسیدہ اور بوڑھی گھوڑی ایسا چہرہ ضرور
دیکھ لیں گے۔ آپ لاکھ میک اپ کریں۔ لاکھ آڈرے ہیپ
برن کی طرح بال کٹتی پھریں۔ لاکھ نو عمر لڑکیوں کی طرح

بات بات پر شرمایا کریں۔ لیکن دس آنے والے عوام کی تیز آنکھیں اس بناؤ سنگار کے پیچھے ایک ہانپتا ہوا بوڑھا جسم ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔

ہیروئن :۔ (پاؤڈر کا ڈبہ اس کے سر پہ مار کر) کمینے نمک حرام میں آج ہی سٹوڈیو کے مالک سے کہہ کر تجھے نوکری سے برخاست کراتی ہوں۔

ماسٹر جی :۔ میڈم! میں کہیں اور نوکری کر لوں گا مگر آپ بڈھی گھوڑی ہی رہیں گی۔ بہتر یہی ہے کہ اب آپ تسبیح ہاتھ میں لے کر نماز پہ بیٹھ جائیں۔ اور باقی عمر یاد اللہ میں گزار دیں۔ سلام علیکم!۔

ماسٹر جی باہر نکل جاتا ہے، اور ہیروئن آئینے کے سامنے چہرہ لے جا کر اپنی جھریاں گننے لگتی ہے۔

. . . .

ایک خُفیہ انٹرویو

جس وقت میں جناب باغ دین مشہور فلم پروڈیوسر اور ڈائریکٹر سے اپنے پرچے کی خصوصی اشاعت کے لئے انٹرویو لینے اُنکے بنگلے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ سو رہے ہیں۔ اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ نوکر نے آکر کہا۔

"جناب سو رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"کیا رات کو شوٹنگ تھی۔؟"

"ہاں جی! ساری رات صاحب جنگل میں شوٹنگ کرتا رہا ہے۔ دو درجن خرگوش مار کر لایا ہے۔"

چونکہ انٹرویو بڑا ضروری تھا۔ پرچے کے مدیر اعلیٰ نے صاف صاف...

کہہ دیا تھا کہ اگر انٹرویو نہ لایا گیا تو مجھے نوکری سے برخاست کر دیا جائے گا۔ چارونا چار میں بنگلے کے برآمدے میں دھرنا مار کر بیٹھ گیا اور پروڈیوسر ڈائرکٹر سیٹھ باغ دین کی بیداری کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد نوکر نے آکر اطلاع دی کہ سیٹھ صاحب آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔ میں نے جیب سے کنگھی نکال کر بالوں میں پھیری۔ ٹائی درست کی۔ کنگ سائز کا سگریٹ پھینک کر کیپسٹن کا سگریٹ سلگایا، اور چق اٹھایا اور یونہی سنبھل کر اندر داخل ہو گیا۔ میں نے سیٹھ کو سلام کیا۔ سیٹھ نے مسکرا کر سلام کا جواب ہاتھ سے دیا، اور ایک اندوہناک ڈکار مار کر صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر نوکر سے کہا۔

"شربت بناؤ جاکر۔"

"جی نہیں شکریہ۔"

"اجی شکریہ کیا۔ گرمی کا موسم ہے شربت ضرور پینا چاہیئے۔"

میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہر چیز بڑی قیمتی اور اعلیٰ تھی۔ مگر بڑے بھونڈے طریقے سے رکھی ہوئی تھی۔ مثلاً دیواروں پر چغتائی کی تصویریں لگی تھیں اور ساتھ ہی فلمی ایکٹرسوں کے کیلنڈر بھی لگے تھے۔ دیواروں کا رنگ نیلا تھا۔ اور کھڑکیوں پر بسنتی رنگ کے پردے پڑے تھے۔ سیٹھ کا اپنا حلیہ یہ تھا۔ چھوٹا سا گھٹا ہوا سر، بھاری بھرکم موٹا اور بھدا جسم، پھولی ہوئی توند۔ گردن جیسے اسی آواز میں بلبلوں ایسی نرمی اور لومڑی ایسی کرختگی، آنکھوں میں کوے ایسا چوکنا پن اور حماقت تھی۔ باسیار طوطے

کی طرح گردن ہلا رہے تھے۔ اور جیب سے چنے نکال کر تھوڑی تھوڑی دیر بعد منہ میں ڈال لیتے تھے۔

" فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔؟ "

میں نے دوبارہ اپنا کارڈ پیش کیا اور کہا۔

" میں ہفت روزہ " فلم ٹائیگ " کا نمائندہ ہوں اور ہمیں اپنی اشاعت خصوصی کے لئے آپ کا انٹرویو درکار ہے۔ اُمید ہے میں آپ سے جو جو سوال پوچھوں گا۔ آپ اس کے موزوں اور صحیح جواب دیں گے۔

سیٹھ نے طوطے کی طرح گردن ہلائی اور توند پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

" کیوں نہیں، کیوں نہیں! ہم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ہم آپ کو ایک ایک بات سچی بتائیں گا۔ "

آپ پوچھئے تو!

میں نے سگریٹ بجھا کر پوچھا۔

" یہ بتائیے کہ آپ فلمی دُنیا میں کیا کام کرتے ہیں۔؟ "

" جی میں فلمیں ڈائریکٹ کرتا ہوں۔ فلموں کے لئے سرمایہ فراہم کرتا ہوں۔ ہندوستان سے فلمیں لا کر چلاتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ "

" لیکن سیٹھ باغ دین صاحب! ہندوستان سے تو فلموں کی درآمد ہماری حکومت نے بند کر دی ہے۔ "

" جی ہاں۔ لیکن پروڈیوسر اپنی فلم کے بدلے میں ایک بھارتی فلم منگوا سکتا ہے۔ "

"اِس کے علاوہ۔ ؟"

"اِس کے علاوہ میرے پاس ریپٹ اُن پکچریں بھی ہیں"

"کیا یہ فلمیں ابھی تک گھسی نہیں ؟ یہ تو بارہ بارہ سال پُرانی فلمیں ہیں۔"

"اجی توبہ کیجئے صاحب ... ! ہم ان فلموں کو کبھی گھسنے دیتے ہیں"

"وہ کیسے ۔؟"

"وہ ایسے کہ ہماری پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انڈیا سے فلم کی شرطیہ نئی کاپی سمگل کروالی جائے۔ اگر ہم اس میں ناکام رہتے ہیں تو اس کاپی کے ڈیلوپ وہاں سے منگوا لیتے ہیں۔ اگر آپ ان فلموں کے پازیٹو دیکھیں تو وہاں سنہ ۱۹۵۰ء کا سن ہوگا اور اگر آپ ڈیلوپ دیکھیں تو وہاں سنہ ۱۹۶۰ء ہوگا "

"اس کا مطلب یہ ہے سیٹھ صاحب کہ آپ بڑے ہوشیار آدمی ہیں۔"

سیٹھ باغ دین ہنس کر بولا۔

"بھائی صاحب ہوشیاری کے بغیر تو یہاں ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہا جا سکتا۔ یہ لائن ہی ہوشیاری کی ہے جس میں ہوشیاری نہیں وہ یہاں کام نہیں کر سکتا۔"

"اچھا یہ بتلائیے کہ آپ فلمی دنیا میں آنے سے پہلے کیا کام کرتے تھے؟"

سیٹھ باغ دین نے دونوں ہاتھ توند پر رکھ کر اس پر زور ڈالا... اور بولا۔

"دماغ پر زور ڈال کر صرف اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ فلمی دنیا میں آنے

سے پہلے میں واہگہ بارڈر پہ سمگلنگ کیا کرتا تھا۔ اُن دنوں میں اتنا موٹا نہیں تھا اور بڑی پھرتی سے اِدھر اُدھر الانگ پھلانگ سکتا تھا۔ بس وہاں سے ترقی کرتے کرتے فلمی دُنیا میں آگیا ہوں ۔"

"معاف کیجئے گا۔ اگر آپ کو یہاں سے واپس جانا پڑے تو آپ کیا کریں گے۔؟"

"بات دراصل یہ ہے جی کہ یہاں سے واپس جاکر تو آپ ادبی سمگلنگ کا دھندا ہی کریں گے۔ لیکن یہاں رہ کر اس کا ٹھرک بھی پورا ہو ہی جاتا ہے۔ دوسرے جب سے مارشل لگا ہے ہمارا آبائی پیشہ سمگلنگ بالکل تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔"

"آپ کی تعلیم کتنی ہے۔؟"

"بس جی وہی گھر پہ تھوڑی سی طبلے کی تعلیم لی تھی۔ اس کے آگے تعلیم جاری نہیں رکھ سکا میں۔"

"معاف کیجئے گا۔ ایک بات یاد آگئی، کیا آپ کے پاس بھارتی فلموں کے آوٹ رائٹ حقوق ہیں۔؟"

اس پر سیٹھ باغ دین نے قہقہہ لگایا اور بولے۔

"نہیں تھے مگر بھارت جاکر ہم نے مل ملوا کر یہ حقوق حاصل کر لئے ہیں۔"

"خوب خوب۔ اب یہ بتائیے کہ آپ اپنی فلم کا سکرپٹ کیسے تیار کراتے ہیں۔"

"سکرپٹ تیار کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہے میں اپنے منشی کو ساتھ لے

کہ گاڑی میں بیٹھ کر امرتسر چلا جاتا ہوں، کسی بھی ہٹ بھارتی فلم دیکھنے سنیما ہال میں منشی کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں۔ میرا منشی فلم کی کہانی تیار کر لیتا ہے۔ گھر آ کر وہ اس کہانی کو فائنل کر لیتا ہے۔ دو تین بار فلم دیکھنے کے بعد وہ سکرین پلے کا چربہ بھی اتار لیتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو ہم فلم کی شاٹ بائی شاٹ ڈیویژن بھی کر لیتے ہیں۔ ہمارے ایک ہندو مہربان ہیں۔ کبھی کبھی وہ بمبئی سے لاہور آتے ہیں تو اپنے ساتھ کسی نہ کسی ہٹ بھارتی فلم کا چربہ چھوٹی فلم پہ اتار کر ساتھ لے آتے ہیں۔ ہم اسے یہاں گھر میں منشی کے ساتھ دیکھتے ہیں، اور نام و مقام بدل کر اس کا پاکستانی چربہ تیار کر لیتے ہیں۔"

"بہت خوب، بہت خوب۔ آپ تو انتہائی ذہین آدمی ہیں؟"

"جی ہاں! دراصل جی یہ کام بڑا محنت طلب ہے۔"

"آپ کے پسندیدہ شوق کیا کیا ہیں۔ ؟"

"اب آپ سے کیا چوری۔ خاکسار کو مالش کروانے کا بڑا شوق ہے۔ اس کے علاوہ رات کو اٹھ کر کبھی کبھی بازار کا ایک آدھ چکر لگا لیتا ہوں۔ ایکسٹرا لڑکیوں سے عشق بھی لڑاتا ہوں اور اپنی بیوی سے محبت بھی کرتا ہوں قراقلی کی ٹوپی اور شلوار میرا من بھاتا لباس ہے۔ بھارت جاتا ہوں تو وہاں تلک لگا لیتا ہوں۔ اور کھدر کا لباس زیب تن کر کے کانگرسی بن جاتا ہوں۔ کیا کریں جی بزنس ہی ایسا ہے۔ کہ سوانگ رچانے پڑتے ہیں۔"

اس کے بعد جناب باغ دین پروڈیوسر ڈائریکٹر نے پیٹ پہ ہاتھ پھیرا۔ دونوں ہاتھ منہ پہ رکھ کر ایک اندوہناک ڈکار مارا۔ اور بولے۔

"آپ کیا کھائیں گے۔؟"

میں نے جھٹ پوچھا!

"ارے ہاں! یہ تو میں بھول ہی گیا کہ آپ کھانے میں کیا پسند کرتے ہیں؟"

"بس صاحب کھانے میں مجھے گدھے کا گوشت، اونٹ کے نتھنے، خچر کے جبڑے، مینڈک کی چانپ اور اُلو کے لیند سے بیحد مرغوب ہیں۔"

"سبحان اللہ آپ تو بڑی کلاسیکل خوراک کھاتے ہیں۔"

"ماشاء اللہ جب ہی اتنا ذہین دماغ پایا ہے۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔ آداب عرض۔۔"

میں انٹرویو لے کر خوشی خوشی اپنے دفتر آیا۔ دوسرے شمارے میں انٹرویو بڑے اہتمام سے شائع کر دیا گیا۔

انٹرویو بے حد پسند کیا گیا۔ ملک کے گوشے گوشے سے مبارکبادیوں کے تار موصول ہونا شروع ہو گئے۔ لیکن دوسرے ہفتے معلوم ہوا کہ سیٹھ باغ دین سمگلنگ کے الزام میں دھر لئے گئے ہیں اور جیل کی ہوا کھا رہے ہیں۔

. . . .

خواجہ عمر عیّار فلم سٹور

خواجہ عمر عیّار فلمی دنیا میں داخل ہونے سے پہلے پارسی تھیٹروں میں کام کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے فن میں بڑے ماہر تھے۔ تھیٹروں کے ڈراموں میں انہیں عام طور پر دو قسم کے پارٹ ملا کرتے۔ یا تو وہ جٹادھاری جوگی کے روپ میں سامنے آتے جو ہیروئن کی موت کے بعد دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں عبرت انگیز گانا گاتا تھا۔ اس کی لاش کے قریب سے گزر جاتا۔ اور یا وہ جلاد بنتا۔ اور بادشاہ کے اشارے پہ چشم زدن میں مجرم کی گردن اڑا دیتا۔ تھیٹر کا دور ختم ہوا تو خواجہ صاحب کا بیکاری کا دور شروع ہو گیا۔ انہوں نے تھیٹر کی چھوٹی بہن "فلم" کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے کئی حربے استعمال کئے۔ اداکاری کی، فلمی کہانیاں لکھیں۔ میک اپ مین کی ٹرائی دی، چوکیداری کی۔ فلم اسٹاروں کی حجامت کی۔ میوزک ڈائریکٹر

بچنے کی کوشش کی۔ مگر انہیں کسی محاذ پر بھی کامیابی نہ ہوئی۔ حالت روز بروز پتلی ہوتی چلی گئی۔ اور جب اتنی پتلی ہو گئی کہ دکھائی نہ دی تو خواجہ صاحب نے ایک پرانی کنڈم تقریباً بکی کہانی حلیہ بدل کر اسے فلمی کہانی میں تبدیل کر دیا۔ پہلے یہ کہانی ایک پتی ورتا استری کی قربانیوں کی ایک نصیحت آموز داستان تھی اور اب وہ ایک جاسوسی اور لڑائی مار کٹائی سے بھرپور کہانی بن گئی تھی۔ اس کہانی میں انہوں نے ایک درجن امریکی فلموں کے ڈرامائی مناظر تھوڑے بہت رد و بدل کے بعد شامل کئے تھے۔ اس کے علاوہ خواجہ صاحب نے پروڈیوسر کو جیسے ڈرامائی انداز میں سنائی۔ ڈرامائی سین پر وہ کرسی سے اچھل کر تن کر کھڑے ہو جاتے اور سینہ پھلا کر پروڈیوسر کو گھورنا شروع کر دیتے، دردناک منظر آتا تو روتے روتے اُن کی گھگھی بندھ جاتی۔ لڑائی کے سین پہ وہ پروڈیوسر سے لپٹ جاتے اور کمرے کی دیواروں سے ٹکریں مار مار کر اپنا سر لہو لہان کر لیتے۔ پروڈیوسر اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے فوراً چیک کاٹ کر عمر عیار کے حوالے کیا۔ اور دوسرے ہی ہفتے کہانی کی فلم بندی کا آغاز کروا دیا۔ خواجہ صاحب کی یہ فلم بڑی کامیاب ہوئی۔ بس کیا تھا دھڑا دھڑ فلمی معاہدے ہونے لگے خواجہ صاحب نے اس ایک کہانی سے بڑا کام لیا۔ اسی کہانی کو وہ ذرا سی تبدیلی کے بعد معاشرتی، تواریخی، اسلامی، سوشل اور پنجابی بنا دیتے۔ معاشرتی کہانی میں وہی ہیرو جو جاسوسی کہانی میں کالا ہیٹ پہنتا تھا، قراقلی کی ٹوپی اور شلوار پہن لیتا۔ پنجابی کہانی میں وہ بانسری منہ کے ساتھ لگا کر

بھینس کے پاس بیٹھ جاتا۔ اور اسلامی کہانی میں ننھا شخص گھوڑے پر سوار تلوار ہاتھ میں لئے نعرۂ تکبیر بلند کرتا دشمنوں کی صفوں میں گھس جاتا۔

خواجہ صاحب کی روزافزوں ترقی اور کامیابی نے انہیں عدیم الفرصت بنا دیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس اتنا وقت نہ بچا کہ وہ فلم کی کہانی لکھ سکیں۔ اب انہوں نے کچھ منشی نوکر رکھ لئے۔ جنہیں خواجہ صاحب نئی فلمی کہانیوں کے ہیرو، ہیروئن اور ولین کے نام اور پلاٹ کا آئیڈیا بتا دیتے اور وہ لوگ فوراً نصف درجن فلمی کہانیاں تیار کر کے رکھ دیتے۔ یہاں سے خواجہ صاحب کو خیال آیا کہ کیوں نہ اس کاروبار میں وسعت پیدا کی جائے اور ایک بہت بڑا فلم اسٹور کھولا جائے۔ جہاں سے میوزک سے لے کر فلمی کہانیوں تک ہر مال مناسب نرخوں پہ مہیا کیا جائے۔

چنانچہ خواجہ صاحب نے "خواجہ عمر عیار فلم اسٹورز" کے نام سے اس اپنی طرز کے انوکھے ادارے کی بنیاد رکھ دی۔ یہ اسٹور شہر کی ایک جدید ترین اور خوبصورت ترین سڑک پہ واقع ہے۔ اسٹور کی عمارت میں داخل ہوں تو بائیں ہاتھ کو خواجہ صاحب کا دفتر ہے دیواروں پہ مختلف فلم ایکٹرسوں، اور ایکٹروں کی تصویریں آویزاں ہیں۔ انہوں نے طرح طرح کے کاسٹیوم زیب تن کر رکھے ہیں۔ کارنس پہ خواجہ صاحب کی اپنی دو تصویریں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک تصویر میں وہ جوگی بنے آنکھیں بند کئے مالا پھیر رہے ہیں۔ اور دوسری تصویر میں وہ جلاد بنے ایک مجرم کی گردن پہ چھری پھیر رہے ہیں۔

خواجہ صاحب کرسی پہ براجمان ہیں اور بے حد مصروف نظر آرہے ہیں۔

میز پر تین عدد ٹیلیفون پڑے ہیں۔ ضرورت مند اندر داخل ہو کر پانچ روپے فیس ادا کرتا ہے۔ اگر اُسے رومانی کہانی مطلوب ہے تو خواجہ صاحب انہیں رومانی ڈیپارٹمنٹ کی طرف روانہ کر دیتے ہیں۔

رُومانی کہانی ڈیپارٹمنٹ

یہاں ایک فلمی جوڑا نقلی تالاب کے کنارے بیٹھا خرمستیاں کر رہا ہے۔

لڑکی کاغذ کا پھول سونگھ کر کہتی ہے

لڑکی :۔ ہائے کتنی سُہانی خوشبو ہے۔

لڑکا :۔ مشک آنست کہ خود ببوید، نہ کہ عطار بگوید

لڑکی :۔ پیارے تم بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔

لڑکا :۔ تمہیں دیکھ کر کون کافر ہوش میں رہ سکتا ہے؟

لڑکی :۔ آہ مجھے اپنی اماں یاد آنے لگی ہے

لڑکا :۔ انہیں بھی یہاں کیوں نہیں لے آئیں۔

لڑکی :۔ محبت ماں باپ سے بے نیاز ہوتی ہے۔

لڑکا :۔ آہ! وہی میری کم نصیبی۔ وہی تیری بے نیازی۔

لڑکی :۔ بکواس بند کرو۔

لڑکا :۔ تم دروازہ بند کرو۔

لڑکی :۔ محبت کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوتا ہے۔

لڑکا :۔ کیا گھر والے سب سو رہے ہیں۔؟

لڑکی :۔ گہری نیند میں۔
لڑکا :۔ ڈوئیٹ گانے کا نادر موقع ہے۔
لڑکی :۔ تو بسم اللہ کیجئے۔
لڑکا :۔ (گلا صاف کرکے) بسم اللہ
میں بن کا پنچھی بن میں خرخر بولوں رے
لڑکی :۔ میں کاٹھ کی ہنڈیا گھر میں کھڑکھڑ بولوں رے
جب یہ دونوں فلمی عاشق معشوق جی بھر کے، گلا پھاڑ پھاڑ کر گا چکتے ہیں تو ایک دوسرے کے گلے کی رگوں پر تیل مالش کرتے ہوئے ہمکلام ہوتے ہیں۔
لڑکا :۔ میں تیری محبت کے جنگل کا طرزن ہوں۔ اور اپنے جذبات کا گوریلا ساتھ لئے تمہاری تلاش میں کھنچتا چلا آتا پھر رہا ہوں۔
لڑکی :۔ مرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر) شی! آہستہ بولو۔ گھر والے جاگ پڑیں گے۔
پھر وہ ٹیڈی سر وہاں سے طرزن کی طرح ایک میٹھی چیخ مارتا ہے، اور ساتھ والے کمرے میں جا گھستا ہے۔

تاریخی کہانی ڈیپارٹمنٹ

اس کمرے میں دربار لگتا ہے۔ ایک بادشاہ بابل والوں کا لباس پہنے فرعون بنا مصر کے تخت پر بیٹھا ہے۔ دربار کے ستون مغل طرز کے ہیں۔ درباریوں میں کسی کا لباس واسکوڈے گاما سے ملتا ہے تو کسی کی پگڑی نانا فرنویس کی

یاد تازہ کرتی ہے۔ ایک سپاہی یونانی لباس میں ملبوس مہا بھارت کے عہد کا تیر کمان لگائے کھڑا پہرہ دے رہا ہے۔ درمیان میں ایک دیوانہ بیٹھا ہوا سلیپنگ سوٹ پہنے کھڑا کھڑا کر رہا ہے۔

بادشاہ :۔ (پاؤں زور سے مار کر) کیوں بے رومن قوم کے ذلیل کتے۔ تیری یہ مجال کہ ہماری ملکہ سے عشق کا دم بھرے۔

دیوانہ :۔ میں ان کی ملیس تک بھرتے کو تیار رہوں۔ بتاؤ میری شیریں حقہ پیتی ہے۔ ایک بار میں یاد رکھا انجن لگا کر دھواں کو اڑا کریں گے۔

دیوانہ عاشق :۔ چل پیاری امین آباد کو چلیں۔ (دونوں باہر نکلتے ہیں) بادشاہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

بادشاہ :۔ (وزیر سے) افراسیاب!

افراسیاب :۔ جی حضور۔

بادشاہ :۔ ہاف سیٹ چائے۔ پتی تیز ہو جلدی!

اتنا سن کر باقی درباری بھی چائے پینے قریب کے ہوٹل کی طرف چل پڑتے ہیں۔ پردہ ڈیوسر صاحب بھی چائے پی کر دوسرے کمرے کا رخ کرتے ہیں۔

بادشاہ :۔ سپاہیو! اس دیوانے کی گردن اڑا دو۔

سپاہی گردن اڑاتے ہیں۔ دیوانے عاشق کی گردن تھوڑی دیر الگ رہنے کے بعد پھر دھڑ سے آن جڑتی ہے۔ درباری تالیاں بجاتے ہیں۔

بادشاہ :۔ (غصے میں دھاڑ کر) خاموش! میں تم سب کی گردنیں اڑا دوں

گا، میں مصر کا بادشاہ ہوں۔

دیوانہ :۔ کیہ گل اے بادشاہو؟

بادشاہ :۔ دیکھ کر سپاہیو۔

سپاہی :۔ (سب ہم زبان ہو کر) جی سرکار!

بادشاہ :۔ اِس بدگمام کو چاروں طرف سے گھیر ڈال کر پا بہ زنجیر کر کے یہاں سے لے جاؤ۔ اور صبح سورج نکلنے سے پہلے کوہِ آتش فشاں میں جھونک دو۔ نہ رہے گا بانس نہ رہے گی بانسری۔

شیریں :۔ (جھروکے سے چھلانگ لگا کر دربار میں کھڑی ہو کر) "مگر یہ بانسری ہمیشہ بجتی رہے گی (تھوڑی دیر راگ مالکونس میں بانسری بجاتی ہے۔ پھر دیوانے عاشق کے گلے میں بانہیں ڈال کر) چل میرے پیارے! ہم ابھی آباد چلے جاتے ہیں۔

اسلامی جوشیلی کہانی ڈیپارٹمنٹ

پروڈیوسر اندر داخل ہوتے ہی سہم کر ایک طرف ہٹ جاتا ہے کیونکہ یہاں ایک اسلامی مجاہد ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں مرغ تھامے گھوڑے پر سوار مجاہدین کے جمِ غفیر سے مخاطب ہے۔ مجاہدین کا نقاہت کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے۔ میک اپ پسینہ بن کر بہہ رہا ہے گھوڑے کی ٹانگیں مارے کمزوری کے کانپ رہی ہیں اور معلوم ہو رہا ہے کہ ابھی گرا کے گرا۔ مگر فلمی مجاہد برابر دھاڑے جا رہا ہے۔

مجاہد :۔ قلعہ کے اسلامی دلیرو۔ اپنی لکڑی کی تلواروں سے سنیما ہال

میں پیش ہو سکے دس آنے۔ ایک روپیہ چھ آنے [illegible]
روپے دس آنے والوں پر دھاوا بول دو۔ یاد رکھو! کوئی
بھی دشمن بچ کر نہ جانے۔ ڈائریکٹر تمہیں ہر تماشبین کے عوض
تین فلموں کا کنٹریکٹ دے گا۔ دشمن بہادر ہے۔ قوی ہے،
ورنہ یہ فلم ہمارے قلعے کی دیواروں تلے کبھی جمع نہ ہوتا۔
ہم نے اس کی جیب تو کاٹ لی ہے۔ اب اُس کی گردن بھی
کاٹیں گے۔ اُس کے دانت کھٹے کر دیں گے۔ اس کے سر پر
پتھروں کی بارش کریں گے۔ یاد رکھو! اس جنگ میں جو سپاہی
زندہ رہا وہ ہیرو کہلائے گا اور جو مر گیا وہ بھی ہیرو کہلائے
گا۔ اب ڈائریکٹر پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کا نام لے کر حملہ کر دو۔
نعرۂ تکبیر۔۔ اللہ اکبر۔۔ اس سے پیشتر کہ فلم کا یہ اسلامی
لشکر حملہ آور ہوتا فلمی کہانی کے خواہشمند پروڈیوسر نے پاؤں
سر پر رکھے۔ اور وہاں سے بھاگ کر سڑک پر آ گیا۔ خواجہ
عمر عیار نے اُسے زندہ نکل کر جاتے دیکھ لیا۔

چنانچہ اس نے تالی بجائی۔ اور
ایک مہیب صورت زنگی اس کے تعاقب میں روانہ کر دیا جیسی تھوڑی
دیر بعد پروڈیوسر کو چوہے کی طرح ہاتھوں میں دبوچے اندر لے آیا۔
خواجہ عمر عیار نے اپنی جوگی والی تصویر الٹ دی۔ جلاد والی تصویر
سامنے رکھ کر میز کے نچلے دراز میں سے ایک نئی فلمی کہانی کا مسودہ نکالا۔
اور پڑھنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد گاہک کی حالت غیر ہونے لگی۔ اُس کے سر کے بال کھڑے ہو گئے۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ اور سر اپنے آپ دائیں بائیں ہلنے لگا۔

خواجہ صاحب کہانی سناتے چلے گئے۔ جب کہانی ختم ہوئی تو گاہک کی روح نفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ کیونکہ اس کہانی میں اسلامی، سوشل، تاریخی، اور رومانی سارے ہی لوازمات شامل تھے۔

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

. . . .

دو ایکسٹرا لڑکیاں

دو ایکسٹرا لڑکیاں سُرخی پوڈر تھوپے سیٹ پر ایک طرف کھڑی ہیں دونوں دُبلی پتلی ہیں۔ دونوں نے اپنی آنکھوں کے سیاہ حلقے پاؤڈر میں چھپا رکھے ہیں اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں۔ ڈائریکٹر نے کہا تھا، کہ تمہارا کام ٹھیک سات بجے شام شروع ہوگا۔ کھانا سیٹ پر ہی ملے گا۔ لیکن رات کے تین بج گئے ہیں! ورنہ دونوں ایکسٹرا لڑکیوں کا کام ابھی شروع نہیں ہوا۔ ویسے اس دوران میں ان دونوں سے یونٹ کے کئی آدمی مختلف کام لے چکے تھے۔ دونوں ایکسٹرا لڑکیوں کے چہروں پر تھکن اور پژمردگی کے آثار ہیں۔ نیند آنکھوں میں دم توڑ چکی ہے۔ کونے میں زمین پر بیٹھ کر ان لڑکیوں نے یونٹ کا بچا کھچا کھانا جانوروں کی طرح کھایا... یونٹ کا ہر آدمی کھانا کھانے کے بعد بھوکی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ہر مذاق

کا جواب مسکرا کر دے رہی ہیں۔ وہ یونٹ کی ملکیت ہیں۔ اُن سے ہر قسم کا کام لیا جا سکتا ہے۔ انہیں ہر فحش مذاق کا جواب خندہ پیشانی سے ہی دینا چاہیے۔ وگرنہ وہ ہیروئن نہیں بن سکتیں۔

ان میں سے ایک سیالکوٹ کی رہنے والی ہے اور دوسری جھنگ کی۔ سیالکوٹ والی کا نام رضیہ ہے اور جھنگ والی کا نام سکینہ۔ دونوں فلم میں کام کرنے کا شوق لے کر یہاں آکر انہیں معلوم ہوا کہ فلمی دنیا میں سوائے فلم کے اور ہر کام ہوتا ہے۔ ان دونوں کی ملاقات لاہور کے ایک سٹوڈیو میں ہوئی۔ جہاں وہ ایک فلم میں ہیروئن کی سہیلیوں کا پارٹ ادا کرنے آئی تھیں۔ رضیہ نے ماتھے پہ بال کاٹ کر ڈال رکھے تھے، اور سکینہ نے بالوں میں گچھے ڈالے ہوئے تھے۔ دونوں بہت جلد ایک دوسرے کی سہیلیاں بن گئیں۔ دونوں ہنس ہنس کر ایک دوسری کو اپنی دُکھ بھری زندگی کی کہانی سناتی رہیں۔

رضیہ سیالکوٹ میں ایک مرد خاوند اور دو بچوں کو چھوڑ کر لاہور آ گئی ہے۔ فلم میں کام کرنے کے علاوہ وہ شام کو لاہور کی سڑکوں پہ گھوم پھر کر بھی کام کرتی ہے۔ اس کا خاوند اُسے روز مارتا تھا۔ کیونکہ وہ گھر میں بن سنور کر رہتی اور فلمی گانے گنگنایا کرتی تھی۔ اُس نے اپنے خاوند سے کہا کہ وہ اُسے لاہور لے جا کر فلم کی ہیروئن بنا دے۔ خاوند نے اُسے مار مار کر الّو بنا دیا۔ پھر وہ اُسے تقریباً ہر روز مارتا۔ الّو بناتا تھا وہ خود الّو نہ بن سکا۔ اُس نے الّو بننا گوارا نہ کیا۔

رضیہ کے دل میں فلم کے عشق نے جوش مارا۔ اس جوش نے ماں باپ کی محبت کو پس پشت ڈال دیا۔ اور وہ ایک روز محلے کے سنار کے ساتھ لاہور آگئی۔ سنار نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ لاہور جاتے ہی ہیروئن بنا دے گا۔ مگر اس نے لاہور آکر اسے ایک مکان میں بند کر دیا۔ اور اس سے عیاشی کرنے لگا۔ اور جب اس کا جی بھر گیا اور جیب خالی ہوگئی تو اس نے دوسروں کو رضیہ سے عیاشی کی دعوت دے کر اپنی جیب بھرنی شروع کر دی۔ رضیہ نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر کچھ نہ کر سکی۔

ایک روز اس کے پاس ایک فلمی گاہک آگیا۔ رضیہ نے اس سے ہیروئن بننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ فلمی گاہک نے جو وقتی عاشق تھا۔ رضیہ کو خوشخبری سنائی کہ وہ اپنی اگلی فلم میں اُسے مسرت نذیر کی جگہ لینے پر تیار ہے۔ رضیہ اس کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب اس کے بھاگنے کا دور شروع ہو گیا۔ وہ ہر آدمی کے پاس بھاگ کر جاتی، اور پھر ایک روز اس کے پاس سے بھی بھاگ کھڑی ہوتی۔ وہ ایک مفرور مجرم بن کر رہ گئی جو گھر کی چار دیواری سے بھاگ نکلی تھی۔ اور جسے کہیں بھی پناہ نہ مل رہی ہو۔ بھاگتے بھاگتے اس کا دم پھول گیا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ گال زرد ہو گئے۔ سینہ ڈھلک گیا۔ کولہے پچک گئے، اور گردن کی ہڈی نظر آنے لگی۔

فلم کے ہر آدمی نے کچھ روز اُسے اپنے پاس رکھا اور پھر اُسے بھگا دیا۔ اب اُسے ہیروئن کے شوق کے ساتھ پیٹ کی آگ بھی سرد کرنی پڑتی تھی۔

شوق سے وہ فلمی دُنیا میں آ گئی، اور پیٹ کے لئے اُسے ہر فلمی و غیر فلمی آدمی کے پاس جانا پڑتا۔

سکینہ جھنگ شہر کے ایک محلّے میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی ماں نے اس کی شادی ایک چپڑاسی سے کر دی۔ چپڑاسی کی داڑھی تھی۔ وہ پانچ وقت کا نمازی تھا۔ لیکن قلمی گیت کا ریکارڈ وہ ایک وقت بھی نہیں سُن سکتا تھا۔ سکینہ کا یہ حال تھا کہ وہ سوائے فلمی گیتوں کے اور کچھ سُن ہی نہیں سکتی تھی۔ اس پر سوائے فلمی گیت کے اور کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ چپڑاسی نے سکینہ کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر سکینہ خوش نہ رہ سکی۔ کیونکہ چپڑاسی خاوند کے پاس فلمی گیتوں کے پلاٹ اور ریڈیو نہیں تھا۔ بلکہ اس نے سکینہ کو منع کر رکھا تھا کہ وہ اس کے گھر میں کبھی فلم کا گانا نہ گنگنائے۔

اس کا نتیجہ بھی وُہی نکلا جو اکثر ایسے حالات میں نکلا کرتا ہے۔ سکینہ کو بھی ایک فلمی گیتوں کا شیدائی مل گیا۔ اس نے سکینہ سے وعدہ کر لیا کہ اگر وہ اس کے ساتھ لاہور بھاگ چلے تو وہ اُسے نیلو بنا دے گا۔

صبیحہ کو بھی میں نے ہیروئن بنایا تھا۔

سکینہ کی باچھیں کھل گئیں اس نے ایک روز تھوڑا بہت زیور ساتھ لیا، چپڑاسی خاوند کو سوتا چھوڑا اپنے عاشق کے ساتھ جھنگ سے ریل میں سوار ہو کر لاہور آ گئی۔

لاہور پہنچ کر سکینہ کا بھی وُہی حال ہوا جو رضیہ کا ہوا تھا اور جو فلم کے

شوق میں گھر سے بھاگی ہوئی ہر رضیہ اور ہر سکینہ کا ہوتا ہے۔ سکینہ بھی کئی آدمیوں کے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی فلم کے سٹوڈیوس آئی، اور یہاں ہر آدمی کے ہاتھ میں کھیلنے لگی۔ کھیلتے کھیلتے اُس کی آنکھوں میں بھی حلقے گہرے ہو گئے۔ گم رخسار کی ہڈیاں باہر نکل آئیں۔ سینہ ڈھلک گیا۔ شوق کا نشہ اُتر گیا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ اور ہر گھر کی تہ گھاٹ کی۔ اب اس کے لیے صرف فلمی گھاٹ ہی رہ گیا تھا جس کا پیر وہ بار بار پانی پیتی۔ اور ہر بار اُس کی پیاس میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہو جاتا۔

رات کے پانچ بج رہے ہیں۔ دونوں ایکسٹرا لڑکیاں سو گئی ہیں۔ اُن کے چہروں پر مُردنی اور بے چارگی ہے۔ ان کا کام نہیں ہوا لیکن کئی لوگوں کا کام ہو گیا۔ اس وقت سیالکوٹ اور جھنگ میں صبح ہو رہی ہے۔ رضیہ کے دونوں بچے سیالکوٹ والے گھر میں اپنے باپ کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں۔ اور ان کا باپ اُن کیلئے چائے بنانے کیلئے آگ جلا رہا ہے۔ اور دھوئیں سے اس کی آنکھوں میں پانی بہہ رہا ہے معلوم نہیں وہ رو رہا ہے۔

اِدھر لاہور کے ایک بس سٹاپ پر جھنگ سے آئی ہوئی ایک ادھیڑ عمر کی عورت اپنی بیٹی کی تلاش میں بیٹھی ہے اور ہر راہ گیر سے پوچھتی ہے۔

"تم نے میری سکینہ کو تو نہیں دیکھا"

. . . .

گوتما نہیں آئی

گوتما نے کہا تھا کہ وہ شام کو ضرور آئے گی۔ مگر شام ڈوبنے لگی ہے اور وہ ابھی تک نہیں آئی ہیں ہوٹل کے لان میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ پال میرے پاس بیٹھا میری سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکال کر سلگا رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے کہ گوتما نہیں آئے گی۔ ایسی لڑکیاں کبھی وعدے پر پوری نہیں اُترتیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ گوتما ضرور آئے گی۔ وہ وعدے پر ضرور پوری اُترے گی۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ وہ بڑی پیاری ہے۔ اس نے چاندنی راتوں میں چاندنی کا سہارا لے کر اپنی محبت کی قسمیں کھائی تھیں۔ اس نے محبت کے دیوتا کے سامنے سر رکھ کر مجھ سے پابندیٔ وفا کا عہد اُٹھایا تھا۔ گوتما کتنی خوبصورت ہے۔ گول گول چہرہ، شربتی آنکھیں اور جوڑے میں لگا ہوا تازہ گلاب کا پھول وہ خود ایک پھول ہی ہے

تازہ گلاب کا پھول۔

ہم دونوں ایک مدت سے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں میں اس کی پوجا کرتا ہوں۔ وہ میری محبت میں مجھ سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ مگر پال کو اس کی محبت اور وفا پر بھروسہ نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ گوتما مجھ سے کبھی محبت نہیں کرتی۔ کیونکہ اس کے خیال میں ایسی لڑکیاں کبھی محبت نہیں کرتیں۔ وہ محبت کرنا جانتی ہی نہیں۔

شام ہونے لگی ہے اور گوتما ابھی تک نہیں آئی۔ شانتی آ گئی ہے۔ شانتی بڑی ماڈرن لڑکی ہے اس کے ہونٹوں کے خم بڑے معصوم ہیں، اس کی معصومیت دیکھ کر مجھے بالی کا خیال آجاتا ہے ——— جسے میں اس کے گھر پہ ہی ملا تھا۔ اس کی ماں اور چھوٹی بہن کے سامنے اس کی ماں چرخہ کات رہی تھی۔ اور اس کی چھوٹی بہن اسکول کا سبق یاد کر رہی تھی۔

میری ملاقات اس کی ماں سے پہلے ہوئی اور بالی سے بعد میں۔ میں اس گلی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ بالی کی ماں مالک مکان کے سامنے رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

"میں کیا کروں، میرے پاس تو کھانے کو کچھ نہیں میں تمہیں مکان کا کرایہ کہاں سے دوں؟"

اور مالک مکان مونچھوں پہ ہاتھ پھیر کر کہہ رہا تھا ——— میں نے غریب لوگوں کے لئے کوئی لنگر نہیں کھول رکھا۔ کرایہ دو۔ نہیں تو صبح ہونے

سے پہلے پہلے یہاں سے اپنا بوریا بستر سمیٹ لو۔

بوڑھی عورت روتی رہی اور مالک مکان چلا گیا۔ میں نے قریب جا کر عورت کی تشفی کی اور کہا۔

" فکر نہ کرو۔ میں تمہارے مکان کا کرایہ ادا کر دیتا ہوں "

اور ـ میں نے مکان کا کرایہ ادا کر دیا۔ محض انسانی ہمدردی کی وجہ سے۔ لیکن جب اس کے بُلانے پر اندر مکان میں گیا تو دیکھا وہاں اس کی بیٹی پالی بھی تھی۔ جس کا جسم جوان تھا۔ اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور ہونٹوں کے پاس بڑا لطیف خم تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دنیا میں انسانی ہمدردی کے علاوہ خوبصورت آنکھوں اور بھرے بھرے ہونٹوں والی پالی بھی ہوتی ہے۔ میں نے اُس بوڑھی عورت کی خاطر مکان کا کرایہ ادا کیا تھا اور اب پالی کی خاطر اِس گھر میں باقاعدہ آنے جانے لگا۔ عورت نے ہمسایوں کو کہہ دیا کہ میں ان کا دور کا رشتہ دار ہوں۔

میں جب اُن کے ہاں جاتا تو پالی میرے لئے چائے بنا کر لاتی۔ میں ہر بار انہیں کچھ نہ کچھ دے آتا۔ کچھ انسانی ہمدردی کے لئے، کچھ پالی کے لئے۔ پالی میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔ میں اگر اس کی طرف دیکھتا تو وہ مسکرا دیا کرتی۔ چُھپ کر اگر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا تو وہ شرما جایا کرتی۔

ایک روز میں اُس کے گھر گیا تو وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اس کی ماں سوت لے کر بازار گئی ہوئی تھی۔ چھوٹی بہن دوسرے کمرے میں بیٹھی اسکول کا سبق یاد کر رہی تھی۔

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا

خدا بڑا عظیم ہے جس نے یہ جہاں بنایا اور جہاں میں خوبصورت
بالی کو بنایا اور مجھے اس قابل بنایا کہ میں بالی کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے
پی سکوں اور اس کے کندھے کو پیار سے دبا سکوں اور مجھے کچھ نہ کہہ سکے۔
بالی نے میرے لئے چائے بنائی۔

جب وہ چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں دینے لگی تو میں کرسی پر سے
اٹھ کھڑا ہوا۔ اور میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ چائے کی پیالی اس کے
ہاتھ میں کانپنے لگی۔

"کوئی دیکھ لے گا۔"

"یہاں کوئی نہیں ہے بالی"

اور واقعی وہاں میرے اور بالی کے سوا اور کوئی نہ تھا اور اگر کوئی
ہوتا بھی تو میرے خیال سے بالی کبھی مزاحمت نہ کرتی۔ کیونکہ اب میں ہر ماہ
ان کے مکان کا کرایہ ادا کرتا تھا۔

میں نے بالی کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ بالی نے ایک جھرجھری سی
لی اور پیالی میز پر رکھ دی۔ اور میں نے اپنے ہونٹ بالی کے ہونٹوں پہ رکھ
دیئے۔ بالی کے ہونٹ خشک تھے۔ گلاب کی پتی کی طرح جو تیز ہواؤں میں اڑتی
جا رہی ہوں۔ ان ہونٹوں میں خوشبو بھی تھی اور نمی بھی۔ موتیے کے پھول
کی طرح جو رات بھر بھیگتا رہا ہو، اور جس کا منہ سورج کی کرن پہلی بار
چوم رہی ہو۔ اس کے بعد میں اور بالی کمرے میں اکیلے تھے۔ کمرے کا دروازہ

بند تھا۔ اور دروازے کے باہر پالی کی چھوٹی بہن اسکول کا سبق یاد کر رہی تھی ہے

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا۔

میں نے گھڑی دیکھی ساڑھے سات بج گئے تھے۔ مگر گوتما ابھی تک نہیں آئی تھی۔ پال میری سگریٹ کیس میں سے ساتویں بار سگریٹ سلگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

" پیارے گوتما یہاں نہیں آئے گی وہ تم سے کبھی نہیں ملنے آئے گی۔

میں حیران ہوں کہ تم اس زمانے میں بھی لڑکیوں کا انتظار کرتے ہو۔"

میں نے کہا۔

" پال تم گوتما کو نہیں جانتے وہ دیوی ہے محبت کی دیوی وہ صرف محبت کرنے کے لئے زندہ ہے اور صرف مجھ سے محبت کرتی ہے اور وہ ضرور آئے گی۔"

پال نے کہا۔

" لیکن وہ ایک سال سے تمہیں نہیں ملی۔ تم ایک سال کے بعد اس شہر میں آئے ہو۔ اور تم نے صرف فون پر گوتما سے بات کی ہے۔ اور اس کی بات پر اعتبار کر لیا ہے۔ تمہیں کیا خبر اس ایک سال میں اس پر کیا کچھ بیت چکا۔ پیارے تم گاؤں میں رہ کر آئے ہو، اور گاؤں میں زندگی کا ایک سال گزرتا ہے تو شہر میں بیس سال گزر چکے ہوتے ہیں۔ جتنی دیر میں کسان کا ہل کھیت کا ایک چکر پورا کرتا ہے۔ اتنی دیر میں شہر کی لڑکی دو عاشق بدل چکی ہوتی ہے۔"

اس کے باوجود مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ پال کی باتیں مجھے بے معنی معلوم ہو رہی تھیں دُنیا بدل سکتی ہے مگر میری گوتما نہیں بدل سکتی۔ پال نے مجھے سگریٹ دیا۔

"لو پیو اور انتظار کی کوفت دُور کرو۔"

میں نے سگریٹ سلگا لیا، اور اس کے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ میرے سامنے ڈانس پر کچھ جوڑے ہلکی ہلکی موسیقی پر رقص کر رہے تھے۔ رقص کے دائرے اُن کے پاؤں میں ٹوٹ ٹوٹ کر بن رہے تھے۔ ایک لڑکی نے بالوں کا جُوڑا بنا کر جوڑے میں گلاب کے پھُول لگا رکھے تھے۔ گلاب کے سُرخ پھُول! گلاب کے سُرخ پھولوں میں نمی بھی ہوتی ہے اور حُسن بھی... اور خواہشات کا سمندر بھی۔ میں بھی انہیں خواہشات کے سمندر میں بہتے بہتے اِن رقص کرنے والی لڑکیوں کے ان گنت نیم شکستہ دائروں میں شریک ہو گیا۔ اور جب گلاب کے سُرخ پھُول مجھ سے جُدا ہوئے تو میں نے گوتما کو ہوٹل کے لان میں داخل ہوتے دیکھا۔

میں خوشی سے پاگل ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ گوتما نے بالوں میں موتیا کے پھُول لگا رکھے تھے۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے پر بڑی معصوم خم تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔ میں نے لپک کر گوتما کا ہاتھ تھام لیا۔ گوتما کے چہرے کی مسکراہٹ ایک لمحے کے لیے سنجیدگی میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں کا خم غائب ہو گیا۔ اسکے ساتھی نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ گوتما نے اپنے بالوں میں موتیا کے

پھول ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

" ان سے ملیئے ! یہ ہیں میرے شوہر شرما صاحب .....اور شرما صاحب یہ ہیں..... "

گو تمام یہ التعارف اپنے شوہر سے کرا رہی تھی۔ اور میرے ذہن میں ہزاروں سورج مکھی اور گلاب کے پھول دہکتی ہوئی آگ میں جل کر بھسم ہو رہے تھے۔ میرے ذہن میں پال کا جملہ گھوم رہا تھا۔

" پیارے تم گاؤں میں ایک سال گزار کر آ رہے ہو۔ جتنی دیر میں کسان اپنے ہل سے کھیت کا ایک چکر پورا کرتا ہے اتنی دیر میں شہر کی لڑکی دو عاشق بدل چکی ہوتی ہے۔ "

. . . .

مری کی ایک رات

شیشم کو میں نے پہلے دن چشمے پر بکری کو پانی پلاتے دیکھا۔ یہ چشمہ ہمارے کالج سے ذرا نیچے جا کر پہاڑی کے دامن میں تھا ذرا اوپر ناشپاتی کا ایک پیڑ تھا۔ جس کی ٹہنیاں پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ اور جھکی ہوئی شیشم بھی اسی طرح پھلوں سے لدی ہوئی چشمے پر جھکی ہوئی بکری کو چشمے پر پانی پلا رہی تھی۔ دو تین شرارتی لڑکے ... ناشپاتی کے درخت کی شاخوں کو زور زور سے ہلا رہے تھے۔ ایک ناشپاتی لڑھک کر چشمے میں آن گری۔ شیشم نے مسکرا کر اوپر لڑکوں کو دیکھا، اور ناشپاتی چشمے کے ٹھنڈے پانی میں سے نکال کر کھانے لگی۔ بکری نے پُر شوق نگاہوں سے شیشم کو دیکھا۔

"ہو ہو۔ نہیں نہیں۔ تم کھاؤ گی تو پیٹ میں درد ہوگا۔"

شیشم بجری کو چھڑی سے ہنکاتی ہوئی سرسبز حصّے کی جانب چل پڑی۔ میں چیڑھ کے ایک درخت کے نیچے ایک پتھر پہ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ شیشم میرے قریب سے گزری اور ذرا سی مسکرا دی۔ میں بھی ذرا سا مسکرا دیا۔ وہ ہرنی کی طرح وہاں سے بھاگ گئی۔ میں پتھر پہ بیٹھا تھا۔ بُت بنا پتھر بنا۔ شیشم کے گال سیب کے چھلکے کی طرح سُرخ تھے۔ رنگ سیب کے گودے کی طرح سفید تھا۔ وہ ایک جنگلی سیب تھی جسے قدرت نے پہاڑ کی چوٹی پہ اُگایا تھا۔ جس کی آبیاری شفاف چشمے کے ٹھنڈے پانی نے کی تھی۔ جسے کوہ ہمالیہ کی بلندیوں سے آنے والی پاکیزہ ہواؤں نے پروان چڑھایا تھا۔ جس کے رنگ میں قوسِ قزح نے اور جس کی خوشبو میں پہاڑ کے سارے پھولوں نے مل کر حصّہ لیا تھا۔

دوسرے روز میں نے اُس سے پوچھا۔

"شیشم! تمہارا نام شیشم کیوں ہے۔؟"

وہ چشمے پہ پانی بھر رہی تھی۔ اُس نے گاگر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"میرے باپو کو پتہ ہوگا"

سیاہ لٹ پھیل کر اس کے ماتھے پہ آگئی۔ میں نے چاہا کہ اپنے ہاتھ سے وہ لٹ پیچھے کر دوں، مگر شیشم ٹیلے کی چھوٹی سی پگڈنڈی پہ چلی جا رہی تھی۔ شیشم اگر دیودار یا چیڑ کا درخت بھی ہوتی تو میں اس سے ضرور محبت کرتا۔ تیسرے روز میں نے شیشم کو ایک ریشمی رومال کا تحفہ دینا چاہا۔ شیشم نے مسکرا کر لینے سے انکار کر دیا۔

"نانا بابو ہم ایسا نہیں کہتے۔ یہ رومال ہمارے کس کام کا؟"
میں نے سوچا کاش میں لاہور سے شیشم کے لئے پانچ سیر امرتسری باقرخانیاں ساتھ لے آتا۔ وہ باقرخانی چائے میں بھگو کر کھاتی اور مجھ سے عشق کرتی۔ کیونکہ عورت اور باقرخانی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس طرح باقرخانی کی کئی ایک تہیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح عورت کی شخصیت بھی تہہ در تہہ ہوتی ہے۔ باقرخانی بھی اس وقت تک نہیں حل ہوتی جب تک۔ اُسے محبت کی گرم چاشنی میں ایک ڈبکی نہ دی جائے۔

باقرخانی زندہ باد۔!

میں نے محبت کا سماوار گرم کرنا شروع کر دیا۔ اس خیال سے کہ شیشم کی باقرخانی کو پیار کی چائے میں ڈبو کر نرم کیا جائے۔ مگر شیشم کے ضمیر میں ٹاہلی کے درخت کی سی پختگی اور پائیداری تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتی اور ایک دو باتیں کرنے کے بعد آگے نکل جاتی، اور میں پیچھے رہ جاتا۔ اتنا پیچھے کہ مجھے شیشم کا ایک سایہ سا اُفق کی لکیر میں گم ہوتا دکھائی دیتا۔

ایک روز سماوار میں پانی جوش کھانے لگا۔ ٹونٹی میں سے بھاپ نکلنے لگی۔ میں نے شیشم کو چیڑ کے درختوں میں ایک جگہ روک لیا اور اس کا کھُردرا ہاتھ تھام کر کہا۔
"شیشم میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم چشمے کا پانی ہو، اور میں

چشمے کا پتھر ہوں۔ تم نہیں ہوتیں تو میں جب بھی سوکھی ریت کے ساتھ سر لگاتے تمہاری راہ دیکھا کرتا ہوں۔ میں طویل برفباری کی راتوں کو اس ویرانے میں پڑا باہر کے جھکیلے کو یاد کرتا ہوں۔ جب برف کی تہوں میں سے پانی کی پہلی لکیر پھوٹ کر چشمے کی زندگی کا آغاز کرے گی۔ اور نا خیالی کے پیڑ پہ محبت کا پہلا سفید شگوفہ پھوٹے گا۔ شیشم میں تمہاری محبت میں اس سرخ پھول کی طرح ہوں جو گہری کھائی میں لوگوں کی نظروں سے چھپ کر اُگا ہوا ور کسی کو علم نہ ہو.....

شیشم کو بھی میری باتوں کا کوئی علم نہیں ہو رہا تھا۔ کوئی سر پیر نظر نہیں آ رہا تھا۔ حالانکہ مجھے اس کا سر پیر جسم کا ایک ایک حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں شیشم سے بالکل اسی طرح عشق کرتا تھا جس طرح ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھانے والا آدمی تھوڑی دیر کے لئے بیرے میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ جب پیار بہت ہوا شیشم کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے خوب سیر ہو کر کھانا کھاؤں۔ چائے پیوں اور جاتے ہوئے شیشم کو کچھ روز کی مسرت کا ٹپ دیتا جاؤں۔ میں شہر کا باشندہ ہوں اور شہر والے محبت میں ادا یا رنہیں کر سکتے۔ رات بھر کر کباب نہیں بنا سکتے۔ تیشے سے سر نہیں پھوڑ سکتے۔ اگر میں مہینوال کی جگہ ہوتا تو سوہنی کے سالمے برتن بھانڈے بیچ کر ایک ہفت روزہ فلمی اخبار نکال لیتا۔ اور سوہنی کو فلم

ایکٹریس بنا دیتا۔ فرہاد ہوتا تو اپنا سر پھوڑنے کی بجائے اس عورت کا سر پھوڑ دیتا جو مجھے شیریں کی موت کی خبر سناتی۔ رانجھا ہوتا تو فقیر ہونے کی بجائے ہیر کے خاوند سے دوستی پیدا کرتا۔ اور پھر اس کے گھر جا کر اس کی بیوی سے چوری چھپے ملا کرتا۔ اور اپنی ران چیر کر اپنی محبوبہ کے لئے کباب بنانے کی بجائے اُسے خیرات کے سینڈوچ کھلاتا۔ کیونکہ ہمارا یہ مقولہ ہے کہ نیکی کرکے دریا میں نیکی کو نہیں، بلکہ نیکی کرنے والے کو ڈالنا چاہیئے۔

میں شیشم کی گردن، ران اور سینے سے عشق کر رہا تھا۔ میں اُسے مجنوں کی نظر سے نہیں بلکہ قصاب کی دلدوز نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شیشم بھی مجھے بکری کی ڈرپوک نگاہوں سے دیکھا کرتی اور وحشت کھایا کرتی۔ میں شیشم کو فلمی مکالموں کے ذریعے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا۔ وہ میری طرف بکری کی نظروں سے دیکھتی رہی۔ اور پھر مسکرا دی۔

"تم کیا کہہ رہے ہو بابو؟"

میں نے کہا۔

"میں تمہارا عاشق ہوں شیشم۔"

"وہ کیا ہوتا ہے۔؟"

"عاشق ایک فونٹین پن ہوتا ہے شیشم جس کی سیاہی کبھی ختم نہیں ہوتی ہیں تمہارا فونٹین پن ہوں۔ مجھے زمین پہ سے اٹھا کر بڑی حفاظت

اپنے گریبان میں لگا لو۔"

شیشم نے مجھے اٹھانے کی بجائے بکری گود میں اٹھا لی اور وہاں سے بھاگ گئی۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری، اور شہر والوں کی سی مستقل مزاجی کے ساتھ اس امپورٹ کے لائسنس کے پیچھے لگا رہا۔

آخر ایک دن میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے شیشم کے لئے مال روڈ پر سے ایک ریشمی کپڑے کا ٹکڑا اور پاؤڈر کا ڈبہ خریدا اور اسے پیش کر دیا۔ شیشم کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ باقر خانی نے چائے کی پیالی میں پہلی ڈبکی کھائی۔ اس کا نصف حصہ نرم ہو گیا۔

اگلے روز میں نے اسے ایک نقلی موتیوں کا ہار دیا۔ باقر خانی کا نصف حصہ بھی چائے میں ڈوب گیا۔ میں نے چائے کی پیالی میں چیلا نما لگا دی۔ شیشم نے رات کو آنے کا وعدہ کر لیا۔

وہ رات میں نے جاگ کر گزاری جب تک شیشم نہ آئی میں پاگل بلے کی طرح کالج کے کمروں میں پھرتا رہا۔ آدھی رات کو جب چیڑ کے جنگل میں اندھیرا چھا گیا تو شیشم آئی۔ اس نے گلے میں نقلی موتیوں کی مالا پہن رکھی تھی۔ میں نے شیشم کو گلے سے لگا لیا۔ شیشم میرے گلے سے لگی اپنے گلے کی مالا سے کھیلتی رہی۔ اور میں اس سے کھیلتا رہا۔ جب ہم دونوں اپنے اپنے کھیل سے تنگ آ گئے تو وہ چلی گئی۔

اب وہ ہر رات گھر والوں سے چھپ کر میرے پاس کھیلنے کو آ جاتی تو ہم دونوں دیر تک کھیلتے رہتے۔ اور جب تھک جاتے تو ایک دوسرے سے جدا

ہو جاتے۔ آخر ایک دن ہم دونوں اس کھیل سے تنگ آ گئے۔ شیشم نے مجھے بتایا کہ اس کا خاوند راولپنڈی میں کہیں چوکیداری کرتا ہے لیکن مجھے اس کے خاوند سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اب مجھے شیشم سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ اب مجھے مال روڈ پر ایک اور شیشم مل گئی تھی شیشم کو بھی اب مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اُس نے بھی ایک اور قصاب تلاش کر لیا تھا۔ وہ کھیلنا چاہتی تھی۔ کھلاڑی چاہے کوئی بھی ہو۔ میں سری سے واپس ہو گیا۔

چھتر پانی پر آ کر بس کھڑی ہوئی۔ تو میں نیچے اُتر کر ایک چائے خانے میں آ گیا۔ یہاں بیٹھ کر میں چائے پینے لگا۔ ابھی ایک بس راولپنڈی سے آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس میں سے ایک دیہاتی اُتر کر میرے پاس چائے خانے میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اور جیب سے دیسی بسکٹ نکال کر چائے میں ڈبو ڈبو کر کھا رہا تھا۔ چائے کے قطرے اس کے منہ سے گر گر کر اس کی میلی سی قمیض پر گر رہے تھے۔ اچانک میرا ہاتھ لگا۔ اس کا ایک تھیلا نیچے گر پڑا۔ میں نے معذرت کی وہ دیہاتی مسکرا دیا۔

"کوئی بات نہیں بابو جی۔"

میں نے یونہی پوچھا۔

"اس میں کوئی ٹوٹنے والی چیز تو نہیں تھی۔؟"

"جی نہیں بابو جی۔ اس میں تو سیمنٹ کا ایک ٹکڑا ہے۔ اور مہندی ہے۔ اصلی مہندی بابو جی۔ دیکھئے تو ذرا۔"

اس نے مہندی کا لفافہ مجھے دکھایا۔ اور چھینٹ کا ٹکڑا۔ سبز چھینٹ پر بسنتی چھوٹے چھوٹے پھول بنے ہوئے تھے۔ دیہاتی کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا تھا۔

ایک سال بعد گھر جا رہا ہوں بابوجی! میری بیوی میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ بابوجی وہ مجھ سے بڑی محبت کرتی ہے۔ ہر روز مجھے پٹواری سے خط لکھوا کر ڈالتی تھی۔ میرے سرتاج تم مجھ سے دور کیوں ہو۔ تم کب گاؤں آؤ گے۔ ہی ہی ہی ...... دیہاتی بیوقوفوں کی طرح ہنس پڑا۔

"اور تب وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگی"

"کیوں نہیں بابوجی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ وہ تو میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ دیکھئے! یہ چھینٹ پیاری ہے ناں۔ یہ میں اپنی بیوی کیلئے لے جا رہا ہوں۔ اور بابوجی میں نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اتنی روپے جمع کر رکھے ہیں۔ یہ سارے کے سارے روپے شیشم کو دوں گا۔ ہ

بابوجی —— بابوجی! شیشم مجھے دیکھ کر کتنی خوش ہوگی۔ آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے" —— میں چونک پڑا۔

بابوجی! شیشم ہے وہ سیب کی طرح سرخ اور .....

اس کے بعد میں کچھ نہ سن سکا۔

دیہاتی مسکرا رہا تھا۔ اس کا چہرہ اپنی بیوی کی یاد میں سرخ ہو رہا تھا۔ اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں چائے نہیں پی رہا بلکہ اپنے سگے بھائی کا خون پی رہا ہوں۔

....

فلمی کہانی اور تربوز

فلم رائٹر نے چق اٹھائی اور دفتر میں داخل ہوگیا۔ آج اُسے ملک جوُندہ پائندہ نے بلایا تھا۔ ملک جوُندہ پائندہ نے اپنے دو چار ساتھیوں سے مل کر یا وہ دو چار ساتھی ملک صاحب سے مل کر ایک فلم بنانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اور اُنہیں کسی ایسی کہانی کی ضرورت تھی جو سوشل بھی ہو، تھوڑی سی فائٹنگ بھی ہو۔ جادو ٹی بھی ہو اور جاسوسی بھی ہو۔ ملک صاحب کو معلوم ہوا کہ ان کے ایک دوست کا دوست فلم رائٹر ہے اور وہ ان کے مطلب کی کہانی لکھ سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے دوست کی وساطت سے اس کے دوست سے بات کی۔ اس شخص نے فلم رائٹر سے بات کی فلم رائٹر کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے اپنا رجسٹر اٹھایا اور وقت مقررہ پر ملک جوُندہ پائندہ کے دفتر میں آن حاضر ہوا۔

ملک صاحب گو اس وقت صوفے پر نیم دراز تھے۔ اور اپنا دایاں ہاتھ پُشت پیچھے جا کر ریڑھ کی ہڈی کو کھجلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ فلم رائٹر کو دیکھ کر انہوں نے ہاتھ پیچھے سے نکال کر آگے کر لیا اور بولے۔

"آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

فلم رائٹر نے کہا۔

"میرا نام شارک مچھلی شہری ہے حضور، اور یہ خاکسار فلم رائٹر ہے۔ آپ کے دوست جناب منشی لدھا صاحب کے دوست جناب بدھا صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کوئی فلم بنا رہے ہیں جس کی کہانی ..... ملک جوئندہ نے ران پر زور سے ہاتھ مارا۔

"بہت خوب، بہت خوب۔!"

"آپ ہیں شارک مچھلی شہری؟"

"جی حضور! جی حضور!"

"بہت خوب تو آپ کہانی لائے ہیں۔؟"

"کیوں نہیں حضور"

اتنے میں ملک صاحب کے ایک اور دوست بھی آ گئے جو کہ اس فلم میں ملک صاحب کے دستِ راست تھے۔ اُن کا نام خدا بخش کھگہ تھا کھگہ صاحب سے ملک جوئندہ نے شارک مچھلی شہری کا تعارف کروایا۔ شارک مچھلی شہری نے ذرا شرما کر کہا۔

"معاف کیجئے گا۔ میں ذرا وضع دار آدمی ہوں۔ اور اپنے کسی بھی دوست

کے پاس خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ چنانچہ یہ خاکسار آپ کی تفریح طبع کیلئے ایک عدد تربوز ساتھ لایا ہے۔ اجازت ہو تو میں حاضر کر دوں "۔

ملک صاحب نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر مسکراتے ہوئے کہا۔

" اس کی کیا ضرورت تھی، شارک صاحب "!

" اجی یہ تو میری خوشی کا معاملہ ہے "۔

" آپ کا چپراسی کہاں ہوگا۔ ؟ "

" باہر ہوگا۔ کیوں خیریت ہے۔ ؟ "

" کچھ نہیں۔ ویسے ہی پوچھا تھا "۔

اتنا کہہ کر شارک مچھلی شہری باہر گیا۔ دفتر کے باہر بیٹر معیوں پر ایک عدد تربوز پڑا تھا۔ جو جسامت میں کسی ہاتھی کے بچے سے کم نہیں تھا۔ شارک مچھلی شہری نے چپراسی اور دو مزدوروں کی مدد سے تربوز کو دفتر کے اندر پہنچایا۔ تربوز کو دیکھ کر ملک جوئیندہ اور خدابخش کھگہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ تربوز نے کمرے کے تیسرے حصّہ کو قبضہ میں لے لیا۔

" حضور۔ میٹھا ہے یہ تربوز "۔

شارک مچھلی شہری نے باہر کی ایک دکان سے آدمی منگوا کر تربوز کو تھوڑا سا کاٹا۔ سُرخ سُرخ تربوز بڑا لذیذ تھا۔ ملک صاحب اور کھگہ صاحب تربوز کی قاشیں کھانے لگے۔ قاشیں اتنی بڑی تھیں کہ جب وہ قاش منہ کے پاس لاتے تو اُن کے مُنہ چھپ جاتے۔ شارک مچھلی شہری نے فلمی کہانی شروع کی۔

"حضور! عرض کیا ہے کہ صبح کا سماں ہے نُور کا تڑکا ابھی ابھی لگتا ہے اندر گھی جلنے کی بُو آ رہی ہے۔ فطرت جانماز پہ بیٹھی تسبیح پھیر رہی ہے آسمان پر اکا دکا ستارے اچکن کے بٹنوں کی طرح نظر آ رہے ہیں۔ پرندوں کی زبانیں صبح کے خیر مقدم میں قینچی کی طرح چل رہی ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا گھاس پر استری پھیر رہی ہے ——"

مالک جوئندہ نے قطع کلامی کر کے پوچھا۔

" شارک صاحب! آپ درزی تو نہیں ہیں؟"

شارک مچھلی شہری نے کہا ۔

" جی نہیں میں ٹیلر ماسٹر —— ہاں حضور

تو عرض کیا ہے کہ نُور کا تڑکا ہے صبح کو بھینی بھینی ہوا چل رہی ہے۔

ایک گائے گھاس چر رہی ہے....."

کھگّہ صاحب گردن کھجلانے لگے ۔

" شارک صاحب کہانی شروع کہاں سے ہوتی ہے۔ ایکشن کہاں ہے؟"

ابھی آتا ہے حضور گائے گھاس چر رہی ہے۔ اچانک ایک آدمی چہرے پہ نقاب ڈالے اِدھر اُدھر دیکھتا نمودار ہوتا ہے۔ اور بھاگ کر گائے کی ٹانگوں میں بیٹھ جاتا ہے۔ اور اس کا دُودھ پینے لگتا ہے۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ تالیاں بجاتے ہیں سیٹیاں بجاتے ہیں۔ دس آنے والی کلاس سے ایک آدمی آواز لگاتا ہے "او ئے ماں کا دودھ پی رہے ہو؟" فرسٹ کلاس والے قہقہے لگاتے ہیں ہال میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور فلم کی

سلوز حویلی کی بنیاد پڑجاتی ہے۔ تو حضور آگے عرض کیا ہے کہ وہ آدمی گائے کا دودھ پی کر جیب سے ریشمی رومال نکال کر ہونٹ پونچھتا ہے۔ لوگوں کی طرف منہ کرکے آنکھ مارتا ہے۔ اور ایک دم بھاگ جاتا ہے۔ اور حضور تربوز میٹھا تھا۔

حضور اس کہانی کو چھوڑیئے۔ کیا عرض کروں؟ ہمارے ماموں کے باغ میں اس سے بھی بڑے بڑے تربوز پائے جاتے ہیں۔ حضور غدر کے زمانے میں ہمارے نانا جان نے ایک تربوز کے پیچھے بیٹھ کر اسے مورچہ بنا کر انگریزوں پر دُور دُور تک گولیاں چلائی تھیں۔ تو عرض کیا ہے حضور کہ دوسرا سین سامنے آتا ہے۔ سینما ہال والے کیا دیکھتے ہیں کہ پردہ سیمیں پر ایک ریل گاڑی گوجرانوالہ کی طرف چلی جا رہی ہے۔ ایک ڈبے میں ہیرو سفر کر رہا ہے۔ ٹکٹ چیکر آکر ہیرو سے ٹکٹ طلب کرتا ہے۔ ہیرو کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ وہ ایک ہاتھ کان پر رکھ کر دوسرا ہاتھ پھیلا کر ایک دُرد انگیز گیت گاتا ہے۔ جس میں اس نے غریب مزدوروں کے جذبات کی عکاسی کی تھی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے سارے لوگ رونے لگتے ہیں۔ دس آنے کلاس والے دھوتیاں کھول کر آنکھوں پر رکھ لیتے ہیں ـــ اور آنسوؤں کی وجہ سے بار بار نچوڑتے ہیں۔ فرسٹ کلاس میں بیٹھی ہوئی عورتیں دھاڑیں مار کر رونے لگتی ہیں۔ بچے اس کو روتا دیکھ کر آسمان سر پہ اٹھا لیتے ہیں۔ خاوند گھبرا کر سینما ہال سے باہر نکل جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ حضور! لیکن ذرا تربوز کو نظر میں رکھیئے گا۔

ہمارے ماموں کے باغ کے تربوز اتنے میٹھے ہوتے ہیں کہ ایک بار کاٹنے سے پھر منہ نہیں کھلتا۔ تو حضور یہاں آکر کہانی کا ہیرو ایک ٹرن لیتا ہے، اور گاتا گاتے ہوئے روتے ہوئے گاڑی سے باہر چھلانگ لگا دیتا ہے۔ دریا میں گرنے سے چھینٹے اڑتے ہیں۔ اور دس آنے کلاس والوں کے کپڑے بھیگ جاتے ہیں۔

یہاں سے ڈیزالو کر کے ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مسجد کے مینار پر ایک مجاہد اذان دے رہا ہے۔ یہاں سے کٹ کرکے ہم ایک محل میں آتے ہیں۔ اور کیا دیکھتے ہیں کہ شام کا عمل ہے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ فانوس روشن ہیں۔ ایک رقاصہ ڈانس کرنے کے بعد اپنی ٹانگوں پر السی کے تیل کی مالش کرا رہی ہے۔ مالش کے بعد وہ اٹھ کر ایک ران پر ہاتھ مارتی ہے۔ اور پھر غسلخانے کی طرف چل دیتی ہے۔ دس آنے والے لوگ چیختے چلاتے رہ جاتے ہیں۔ مگر رقاصہ چلی جاتی ہے اور مڑ کر بھی نہیں دیکھتی۔ تو حضور تربوز کے بارے میں کیا خیال ہے۔" اب جو شارک مچھلی شہری نے رجسٹر پر سے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے ملک جوشندہ اور خدا بخش کھگہ بے ہوش پڑے تھے۔ اور اُن کے منہ سے جھاگ بہہ رہے تھے۔ شارک مچھلی شہری نے دو مزدور منگوا کر تربوز اُٹھوا کر ریڑھے پر لادا۔ اور زار و قطار روتا ہوا دوسرے فلم کمپنی کے دفتر کی طرف چل پڑا۔

. . . .

رخصتی کا گیت

الوداع! تم فلمی صنعت کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر فیوجی یاما جا رہی ہو. خدا ایسے علاقے میں تمہاری حفاظت کرے جس کا نام فیوجی یاما ہے. تم نے ایک جاپانی تاجر سے شادی کر لی ہے. یقیناً تم نے جاپانی تاجر کو سبز باغ دکھائے ہوں گے. ورنہ وہ کبھی تمہارے جھانسے میں نہ آتا. تم اس ٹھگنے سرمایہ دار کے ساتھ فیوجی یاما جا رہی ہو. سنا ہے فیوجی یاما میں اس آدمی کا ایک محل ہے. وہ کھلونے بنانے والے ایک کارخانے کا مالک ہے. تم نے کھلونا سمجھ کر اس سے شادی کی ہے. اور وہ کھلونا سمجھ کر ایک دن تم کو چھوڑ دے گا.

یہ کھلونوں کا کھیل بڑا دلچسپ ہوتا ہے. تم یہاں نہیں ہو گی تو یہ کھیل بڑا یاد آئے گا. تم ماضی کی حسین یادوں کو سینے کے بالوں میں چھپائے لئے جا رہی ہو. فیوجی یاما کے محل میں اپنے جاپانی فیوجی شوہر کو گھٹنوں پر بٹھا

کہ تم پہروں یادوں کی یاد میں ڈوبی رہوگی۔

تمہیں خیال آئے گا ان حسین لمحات کا جب پہلے پہل تم برقعہ اوڑھ کر ایک گراموفون کمپنی کے دفتر میں نعت کا ریکارڈ بھروانے آئی تھیں۔ تم نے بالوں کو کس کر چوٹیا گوندھ رکھی تھی۔ دوپٹہ برقعے کے اندر بھی سر کے اوپر کر رکھا تھا۔ تم نے ڈرتے ڈرتے، کانپتے کانپتے ریکارڈ بھروایا تھا۔

لیکن تمہارے ابا جی تمہارا حوصلہ بڑھاتے رہے تھے۔ تمہارے ابا جی نے ہمیشہ تمہاری حوصلہ افزائی کی ہے۔ حقیقت میں تمہارے فن کی تمام خوبیاں اور تمہارے گداز جسم کے سارے کمالات تمہارے ابا جی کی چشم پوشیوں اور مہربانیوں کے مرہون منت ہیں۔

پھر جب پہلے پہل گراموفون کمپنی کے پروگرام ڈائریکٹر نے ایک دن وِٹینگ روم میں تمہارا بوسہ لیا تھا تو تم چھوئی موئی بن گئی تھیں۔ جس طرح کہ عام گھرانے کی لڑکیاں چھوئی موئی بن جایا کرتی ہیں۔ مگر اس وقت تم فیوجی یاما نہیں ہوتی تھیں۔

یہاں سے ترقی کر کے تم نے برقعہ اتار کر اپنے ابا جی کو دے دیا جنہوں نے اسے اپنی پگڑی میں لپیٹ کر گھر کی کھپریل کوٹھڑی میں چھپا دیا جہاں وہ پھر کبھی نہیں گئے۔

آج تم ایک کھاونے بیناتے والے جاپانی کی مشین بن کر فیوجی یاما جا رہی ہو تو اے ملک کی فلمی صنعت کی مایۂ ناز اداکارہ تمہارے پرستار تمہارے برقعے اور تمہارے ابا جی کی پگڑی کو یاد کر کے بہت کچھ سوچا کریں گے۔

آہ! میں رومانٹک ہو رہا ہوں۔ اب میرے قلم میں سے رسالے جھڑیں گے میرا
حلق خشک ہونے لگا ہے اور سر کے بال کھڑے ہو گئے ہیں میں جب رومانٹک
ہوتا ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ کسی عورت سے بھاگ کر لپٹ جاؤں۔
اور اگر سامنے کوئی عورت نظر نہ آئے تو کسی درخت سے بغلگیر ہو جاؤں۔

آہ! چاندنی رات ہے، ستارے پھر رہے ہیں۔ چاند مسواک کر رہا ہے۔
رات کی دلہن چاند کے شہ بالے کو گود میں جھلاتے اپنے سسرال چلی جا رہی ہے
جس طرح تم اپنے کھلونے کو لئے فیوجی یاما جا رہی ہو۔

جب تمہیں تنہائی میسر آئیگی اور تنہائی کی معروفیات سے فراغت حاصل
ہوگی تو تم اپنی پنڈلیوں کے بالوں پر انگلیاں پھیر کر ان دنوں کی یاد میں کھو
جاؤگی جب تم برقعہ اوڑھ کر اپنے اباجی کے ساتھ گراموفون کمپنی کے دفتر میں
ریکارڈ بھروانے جایا کرتی تھیں، اور پروگرام دینے والے تمہارے جسم کی ابھری ہوئی
فیوجی یاما کی چوٹیوں کو گھورا کرتے تھے۔ ہر آدمی کی یہی خواہش ہوا کرتی کہ وہ ان
چوٹیوں میں جا کر آباد ہو جائے اور ساری عمر اللہ اللہ کر کے گزار دے۔

اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ فیوجی یاما کی چوٹیاں ان دنوں بڑی دلکش
ہوا کرتی تھیں۔ ان دنوں تو ہر آدمی ان چوٹیوں پر بھکشو بنکر آباد ہونے کو تیار رہتا۔

اصل میں تمہارا جسم خوب موٹا تازہ تھا۔ اگرچہ تمہاری آواز بیکار تھی۔ جب
گراموفون کمپنی والوں نے تمہاری آواز سنی تو انہیں ناامیدی ہوئی جب انہوں نے
کپڑوں میں پھنسا تمہارا گداز جسم دیکھا تو خوشی سے انکی باچھیں کھل گئیں اور رال
بہنے لگی۔ انہوں نے تمہارے بدن کے نشیب و فراز گنتے ہوئے تمہاری آشا پر
واہ واہ کے نعرے بلند کئے۔ ایک نے کہا۔

"ملک کو جس فنکار کی ضرورت تھی وہ پیدا ہو گئی ہے۔ آفتاب فلم انڈسٹری کا چاند طلوع ہو گیا ہے فلمی صنعت کے آسمان پر ایک اور ضو مدار ستارا ابھر آیا ہے"

جب تم چلی گئی تھیں تو اس آدمی کو دوسرے نے پوچھا۔

" ملک کو جس فنکارہ کی ضرورت تھی یا ہمیں جس فنکارہ کی ضرورت ہے۔ وہ پیدا ہو گئی ہے"

اس نے آنکھ مار کر کہا۔

"مطلب یہی تھا"

تمہارے اباجی نے تمہیں آرٹ کی خدمت کیلئے وقف کر دیا اور تم نے اپنے آپ کو آرٹ کے پرستاروں کے حوالے کر دیا۔ تمہاری شادی جب تم برقعہ پہنتی تھیں تمہارے ہی محلے کے ایک کلرک سے ہونے والی تھی جس کی تنخواہ ۶۰ روپے مہنگائی الاؤنس اور پانچ روپے سال کی ترقی۔ کل ۱۵۰ روپے تھی لیکن جب تم فنکارہ بن گئیں تو کلرک اپنے مہنگائی الاؤنس کے ساتھ اپنی سائیکل پر سوار بہت پیچھے رہ گیا اور تم آرٹ کی خدمت کرتیں اپنے پروڈیوسر کی جیب میں ہاتھ ڈالے بہت دور نکل گئیں۔

الوداع! آج تم فیوجی یاما جا رہی ہو۔ تمہاری منزل فیوجی یاما ہی تھی۔

اب تم نے تن من دھن سے آرٹ کی خدمت شروع کر دی تم گھر پر ہوتیں، کار میں ہوتیں، صوفے پر ہوتیں، سٹوڈیو کے پیچھے ہوتیں یا غسل خانے میں ہوتیں۔ آرٹ کی خدمت سے کبھی باز نہ آتیں۔ آرٹ بھوت بن کر تمہیں چمٹ گیا تھا۔ اور تم بھوتنی بن کر آرٹ کے نام پر روپیہ بہانے والوں سے چمٹ گئی تھیں۔ تم نے بال کٹوا لئے

سینہ اوپر اٹھوا لیا۔ بھنویں ترشوا لیں۔ تمہارے پیارے ابا جی نے بھی مونچھیں منڈوا لیں۔ تم نے پروڈیوسروں کی جیبوں اور لوگوں کے دلوں پر قبضہ جما لیا۔

آہ! میں پھر رومانٹک ہو رہا ہوں۔ چاند میرے سامنے آہستہ آہستہ اپنے کپڑے اُتار رہا ہے۔ چاندنی منہ پر ہاتھ رکھے اپنی کھانسی روکے کھڑی ہے۔

گوبھی کا ایک درخت حلوہ کدو کا بہترین پھول نکلنے اونگھ رہا ہے۔ اور کبھی کبھی حلوے کدو پر ہاتھ بھی پھیر لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کبھی کبھی آرٹ کے شیدائی تمہارے شانوں پر ہاتھ پھیر لیا کرتے تھے۔ اور میں اپنا سر دُھن رہا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جاپانی کھلونوں کے تاجر کو گود میں اٹھا کے فیوجی یاما جا رہی ہو۔ اب میں کس کے دسترخوان پر بیٹھوں گا۔ کس کی کار کا دروازہ کھولوں گا؟ کس کی تعریف میں مضمون لکھوں گا۔ کس کے ابا جی کی مونچھوں پر عطر لگایا کروں گا۔ کس کا پرس اور کوٹ تھام کر سٹوڈیو کے باہر کھڑا رہا کروں گا۔

تم سُہاگ کی رات فیوجی یاما میں بسر کرو گی۔ سُہاگ کی رات کو وہ تمہیں راتیں یاد آئیں گی جو تم نے آرٹ کی خدمت میں گزار دیں۔ وہ راتیں جنہوں نے تمہارے اور تمہارے ابا جی کے دلوں کو روشن کر دیا۔ جنہوں نے تمہارے ہونیوالے کلارک خاوند سے تمہیں چھین لیا۔

فیوجی یاما صحت افزا مقام بھی ہے۔ اسکی چوٹی کئی ہزار فٹ اونچی ہے۔ اس پر ہمیشہ برف رہتی ہے۔

تم جا رہی ہو فیوجی یاما کے جاپانی کھلونوں کے تاج پر سارا سال جمی رہا

کرو گی جب تک کہ وہ کوئی دوسرا کھلونا ایجاد نہیں کر لیتا۔ اور جب کہ تمہارا
اس کھلونے سے جی نہیں بھر جاتا۔

اگر تم آج اس سائیکل سوار کلرک کی بیوی ہوتیں تو تمہارے سر پہ دوپٹہ ہوتا
تمہارے بچے جا نماز پہ بیٹھ کر نماز پڑھا کرتے۔ تم ان کیلئے مشین پر کپڑے سیا کرتیں۔
رات کو اپنے خاوند کیلئے کھانا تیار کرتیں اور اسکے پاؤں دابتیں پھر تمہیں سوائے
دو تین محلے داروں اور رشتہ داروں کے اور کوئی نہ جانتا لیکن تم بیوی ہوتیں۔
وہ عورت جسے جب تک کوئی نہیں جانتا وہ اپنے مقام پہ روشنی کا مینار بن کر
چمکتی ہے اور جب اُسے کوئی جاننے لگتا ہے تو وہ روشنی کا مینار بجھ جاتا ہے۔
پھر وہ چمنی سے نکلتا ہوا دھواں بن جاتی ہے۔

تم بھی چمنی کا دھواں ہو۔ تم علی بابا کی وہ غار ہو جہاں کی دولت سب
لوٹ کر لے گئے ہیں اور جہاں اب سوائے قاسم کی لاش کے اور کچھ نہیں۔

آہ! میں پھر رومانٹک ہو رہا ہوں۔ گوبھی کے درخت پہ حلوہ کدو کے
سنہری پھول......

چاند..... پھر کپڑے اُتارنے لگا ہے..... آہ! میرا حلق خشک
ہو رہا ہے۔ بال کھڑے ہو رہے ہیں۔

آہ! گوبھی کا درخت۔!
حلوہ کدو کے سنہری پھول۔!.....

. . . .

کامیڈین کی ٹریجڈی

ماسٹر قریشی کامیڈین فلمی حلقوں میں اپنی ظریفانہ طبیعت نازک چٹکلوں اور ہنسوڑ مزاج کی وجہ سے اور غیر فلمی حلقوں میں اپنی اداکاری کے لئے بہت مقبول تھا۔ اس کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ جدھر سے گذر جاتا لوگ نعروں سے اس کا خیر مقدم کرتے۔ اور ہاتھ ملانے میں ایک دوسرے پہ سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔

ماسٹر قریشی کی فلمی حلقوں میں مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شوٹنگ کے دوران اگر تھوڑا سا وقفہ مل جاتا تو اس کے ساتھی اداکار اور اداکارائیں اس کے گرد جمع ہو جاتیں۔ اور اس کے برجستہ جملوں، شگفتہ مذاق اور ہلکے پھلکے گیتوں سے لطف اندوز ہوتیں۔ ماسٹر قریشی گانے میں بڑا سریلا تھا۔ قدرت نے اُسے بڑا پرسوز گلا عطا کیا تھا۔

ماسٹر صاحب کے پاس بیک وقت درجن درجن بھر فلمیں موجود رہتیں۔
جن میں وہ کامیڈین کا رول کر رہے ہوتے۔ انہیں سر کھجلانے کی فرصت نہ
ہوتی۔ ایک سٹوڈیو سے دوسرے سٹوڈیو کی طرف ٹیکسی انہیں بھگائے لئے پھرتی۔
لیکن آج سے چھ سات سال پہلے ماسٹر صاحب کی یہ حالت نہ تھی۔ ان
دنوں وہ درزی کا کام کرتے تھے۔ شہر کے اندر ان کی ایک چھوٹی سی دکان تھی
جہاں وہ اپنے دو تین شاگردوں کے ساتھ بیٹھے صبح سے شام تک کپڑے سیا
کرتے تھے۔ محلے میں اُن کی بڑی عزت تھی۔ وہ بڑے شریف، قانع اور مرنجاں
مرنج آدمی تھے۔ شام کو وہ گھر جا کر اپنے بیوی بچوں میں بیٹھ کر روٹی کھاتے
اُن سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے۔ انہیں نقلیں کرکے ہنساتے۔ اُن کی توتلی
زبان سے باتیں سُن سُن کر خوش ہوتے۔ بیوی کی بھی خبر گیری کرتے۔ جمعہ کو چھٹی
کرتے اور دکان کے اندر اپنے دوستوں کے ساتھ ڈھولک اور ہارمونیم
لے کر بیٹھ جاتے۔ چائے یا تار سے آ جاتی۔ رات گئے تک گانے بجانے کی
چھوٹی سی محفل سی لگی رہتی۔ ماسٹر صاحب اپنے دوستوں کو کبھی مسخرہ بن کر کبھی بادشاہ
کا پارٹ کرکے دکھاتے کیونکہ انہیں گانے کے علاوہ فلم میں اداکاری کرنے
کا بھی بڑا شوق تھا۔ فلم وہ ہر دوسرے تیسرے روز سنیما میں جا کر دیکھتے۔
آہستہ آہستہ انہوں نے کوشش کرکے ایک فلم میں لباس بنانے کا ٹھیکہ
لے لیا۔ انہیں کافی فائدہ ہوا۔ مگر اصلی فائدہ یہ ہوا کہ وہ فلمی دنیا سے متعارف
ہو گئے۔ انہوں نے فلم ڈائریکٹر کو اپنے گانے، ڈانس اور مزاحیہ حرکتوں سے
اس بات پر قائل کر لیا کہ اگر انہیں فلم میں چانس دیا گیا تو وہ بڑے کامیاب
ثابت ہوں گے۔

چنانچہ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد انہیں ایک فلم میں کام مل گیا۔ پہلی ہی فلم میں کامیابی نے اُن کے قدم چُوم لئے۔ وہ راتوں رات مشہور ہو گئے۔ اور لوگوں نے انہیں بطور کامیڈین قبول کر لیا۔ اب انہیں دو تین مزید فلموں میں کام مل گیا۔ ان ساری فلموں میں انہوں نے اس خوبی سے کامیڈین کا رول نبھایا کہ فلمی دُنیا میں ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ دوسرے کامیڈین ایکٹروں کو اپنے مستقبل کی فکر پڑ گئی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ باشر قریشی میدانِ عمل میں کُود چکے تھے۔ ان پر شہرت اور دولت کے دروازے کُھل چکے تھے۔ انہیں کوئی روک نہیں سکتا تھا۔

پہلی فلم میں انہوں نے پانچسو روپے کے قلیل معاوضے پر کام کیا تھا۔ دوسری فلم میں انہوں نے ایک ہزار روپیہ لیا۔ اور جب ان کی ہر فلم ہٹ ہونے لگی تو ان کا بھاؤ بڑھتے بڑھتے پانچ سے آٹھ ہزار اور پھر دس ہزار تک پہنچ گیا۔ انہوں نے شہر کے اندر اپنی درزی کی دکان بند کی۔ شاگردوں کو چھٹی دی۔ اور شہر سے باہر ایک خوبصورت کوٹھی لیکر رہنے لگے۔ اب تو انکی دُنیا ہی بدل گئی تھی۔ گھر میں ریڈیو گرام آ گیا تھا جہاں پہلے گراموفون بھی نہیں ہوتا تھا۔ الماریوں میں تامچینی اور مٹی کے برتنوں کی جگہ چینی کے ڈنر سیٹ اور ٹی سیٹ آ گئے۔ انہوں نے ایک گاڑی بھی خرید لی۔ کتنے ہی گرم سوٹ بنوا لئے۔ بیوی کی بھی کایا پلٹ گئی۔ اسکے پاس بھی قیمتی کپڑوں کا ڈھیر جمع ہو گیا۔ یہ کُنبہ جو کل تک شہر کی ایک چھوٹی سی گلی میں روکھی سوکھی روٹی کھا کر خدا کا شکر ادا کر کے گزارہ کر رہا تھا اب ایک شاندار کوٹھی میں اعلٰے کھانے کھانے لگا۔

بیوی اس خوشگوار انقلاب پر خوش تھی۔ انہیں اگر کوئی غم تھا تو صرف اتنا کہ ماسٹر صاحب نے چائے چھوڑ کر اب شراب پینی شروع کر دی تھی۔ شروع شروع میں تو صرف شام کے وقت تھوڑی سی پی لیا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے دن کے وقت بھی پینی شروع کر دی۔ پھر عالم یہ ہو گیا کہ دن بھر نشے میں رہنے لگے۔ بیوی کو یہی کہتے تھے کہ تھوڑی سی پیتے ہیں۔ اور محض اس وجہ سے کہ زیادہ کام کی وجہ سے انہیں تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔ اور اس تھکان کو صرف شراب ہی دور کر سکتی ہے۔

کیا کروں بیگم آخر روپیہ بھی تو کمانا ہوتا ہے۔ ایسا نہ کروں تو گھر کا اتنا سارا خرچ کیسے چلے۔ دو سو روپے تو کوٹھی کا کرایہ ہی ہے۔ پھر گاڑی کا خرچ ہے ڈرائیور کی تنخواہ ہے نوکر ہیں۔

بیوی چپکی ہو رہتیں۔ ماسٹر صاحب شراب میں دن بدن غرق ہوتے گئے۔ شراب ان پہ سوار ہو گئی۔ شراب نہ پئیں تو بدن چلنے پھرنے، اور دماغ کام کرنے سے انکار کر دیتا۔ چونکہ وہ بڑے کامیاب کامیڈین تھے اس لئے پروڈیوسروں کو مجبوراً ان سے کام کروانے کیلئے انہیں پہلے سے شراب پلانی پڑتی تھی۔ پروڈکشن کی گاڑی انہیں گھر سے لے جانے آتی تو ماسٹر صاحب گھر سے سٹوڈیو تک آدھی بوتل شراب خالی کر دیتے۔ اور جی لگا کر کام کرتے۔

ان کی فلمیں دھڑا دھڑ کامیاب ہو رہی تھیں لیکن ماسٹر صاحب کی صحت گرنے لگی تھی۔ وہ دُبلے ہو گئے تھے۔ جگر میں درد رہنے لگا تھا۔ آنکھیں کمزور ہو رہی تھیں۔ دل کے دورے پڑنا شروع ہو گئے تھے انہوں نے کھانا پینا بھی بے حد کم کر دیا تھا۔ کھانے کی جگہ شراب پیتے۔ اور جب تھک جاتے تو مزید شراب کی تلاش میں نکل جاتے۔

آہستہ آہستہ عالم یہ ہو گیا کہ وہ چوبیس گھنٹے شراب کے نشے میں دُھت رہنے لگے۔ اب انہوں نے فلمی کاموں میں بھی تغافل برتنا شروع کر دیا۔ انہیں شوٹنگ کی تاریخیں بھی یاد نہ رہتیں۔ پروڈیوسر گاڑی بھیجتا تو ماسٹر صاحب شراب کے نشے میں دُھت ڈرائیور کو گالیاں دینا شروع کر دیتے۔

پروڈیوسر تنگ آ گئے اُن کے لاکھوں روپے خرچ ہو رہے تھے۔ وہ یہ کس طرح گوارہ کر سکتے تھے کہ ماسٹر صاحب ہر بار انہیں نخرے دے جائیں۔ اور صرف اُن کی وجہ سے انہیں شوٹنگ پیک اپ کرنی پڑے چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ پروڈیوسر نے غنڈوں کی خدمات حاصل کر لیں۔ غنڈے اٹھا کر ماسٹر صاحب کو سٹوڈیو لے جاتے۔ اب ان کی پٹائی بھی ہونے لگی۔ ایک بار اُنہیں اتنا پیٹا گیا کہ اُن کے چہرے پر زخموں کے نشان اُبھر آئے۔ اور وہ ہسپتال میں دو روز تک پڑے رہے۔

بیوی اُن کی دیکھ بھال کرتی اور روتے ہوئے کہتی۔

"یہ کام چھوڑ دیجئے۔ میری مانیے۔ ہم پھر اپنے شہر والے مکان میں چلے جاتے ہیں۔"

لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ چڑیاں کھیت چگ گئی تھیں۔ ماسٹر صاحب کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ شراب کی زیادتی اپنا کام کر گئی۔ ان کے پھیپھڑے خراب ہو گئے تھے۔ جگر چھلنی ہو چکا تھا۔ چنانچہ ایک روز صبح صبح ساری فلم انڈسٹری میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ ماسٹر صاحب انتقال کر گئے ہیں۔

فلمی اخباروں نے بڑی بڑی سرخیاں لگائیں۔ اداکاروں کی انجمن نے تعزیتی قرارداد منظور کیں۔ اس کے جنازے پر ہر ایکٹر اپنی کار میں بیٹھ کر آیا۔ اور دو آنسو بہا کر اسی کار پر واپس چلا گیا۔ کئی پروڈیوسروں اور ڈائرکٹروں اور ایکٹروں نے مرحوم کے پسماندگان کو امدادی رقمیں دینے کا شاندار اعلان کیا۔ اس اعلان پر ان کی بڑی پبلسٹی ہوئی۔

لیکن مرحوم کی بیوی کو ایک پائی بھی نہ ملی وہ بے چاری کوٹھی سے باہر نکال دی گئی۔ اور پھر سے شہر کے اندر ایک کوٹھڑی کرائے پر لیکر بچوں کے ساتھ رہنے لگی۔ وہ لوگوں کے کپڑے سی کر اُن کے برتن مانجھ کر بچوں کا پیٹ پالتی۔ اور خدا کا شکر ادا کرتی۔

آخر ایک درد مند دل والے اداکار نے ماسٹر مرحوم کے پسماندگان کی امداد کیلئے ایک ورائٹی شو کا انتظام کر دیا۔ انڈسٹری کے ہر ایکٹر اور ہر ایکٹریس نے تعاون کا یقین دلایا۔ بڑے بڑے پوسٹر شائع کئے گئے جس سنیما میں یہ شو ہونے والا تھا۔ اُسے خوب سجایا گیا۔ ہزاروں روپوں کے ٹکٹ بکنے کی توقع تھی۔ کیونکہ لوگ ایکٹرسوں کے دیکھنے کے شوق میں جوق در جوق آئے ہوئے تھے۔ مگر شو کا منیجر اس وقت تک ٹکٹ ایشو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب

تک اُسے یقین نہ ہو جاتا کہ اداکار ہال کے اندر پہنچ گئے ہیں۔

چنانچہ یہی ہوا۔ جب شو کا وقت آیا تو سوائے دو ایک معمولی اداکاروں کے اور دو ایک ایکسٹرا ایکٹرسوں کے اور کوئی وہاں نہ پہنچا۔ بڑے بڑے فنکاروں کے فون آنا شروع ہو گئے۔ کہ چونکہ ان کی شوٹنگ ہو رہی ہے اس لئے آنے سے معذور ہیں۔ معذرت قبول فرمائی جائے۔

ایک مشہور ایکٹرس جس نے مرحوم کے حق میں دو کالمی بیان دیا تھا۔ فون پہ بولیں۔

"منیجر صاحب بڑا افسوس ہے شوٹنگ کا
وقت تبدیل نہیں ہو سکا۔ بتایئے میں
کیسے آسکتی ہوں۔ معافی مانگتی ہوں سخت
شرمندہ ہوں۔ بائی بائی۔"

چنانچہ جب وقت ہو گیا اور ایک بھی دردمند فنکار مرحوم کی امداد کو نہ پہنچا تو لوگوں نے جو باہر ہال میں جمع تھے۔ شور مچانا شروع کر دیا انہوں نے باہر لگے ہوئے پوسٹر اُتار کر پھینک دیئے۔ جھنڈیاں تار تار کر دیں۔ گیٹ توڑ دیا۔ گملے اٹھا کر سڑک پہ پھینکنے شروع کر دیئے۔

جب طوفان تھم گیا، لوگ چلے گئے تو منیجر گنجے سر پہ ہاتھ رکھ کر کرسی پہ بیٹھا تھا۔ اور اس کے ارد گرد سوائے اُن پھٹے ہوئے اشتہاروں کے اور کچھ نہ تھا، جن پہ لکھا تھا۔

"مرحوم ماسٹر نرسنگی کے پسماندگان کی

امداد کے لئے فنکاروں کا ورائٹی شو۔

فنکار کبھی نہیں مر سکتا۔

فن کار واقعی مر کر بھی نہیں مرا کرتا۔ لیکن اس ملک میں اس کے پسماندگان زندہ رہ کر بھی زندہ کہلانے کے قابل نہیں ہوتے۔

. . . .

ڈرامہ ستّی نیّوں جدید

گُل پیلواں کے تھیٹر میں آج بڑی چہل پہل ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ آج یہاں کمپنی کا نیا کھیل شروع ہونے والا ہے۔ اِس کھیل کا نام "ستّی نیّوں" ہے۔ اِس میں ماسٹر بجو ریڈیو سنگر اور مس چنچل ریڈیو سنگر ہیرو ہیروئن کا کام کر رہے ہیں۔ پنڈال میں گڑھا کھود کر دری بچھا دی گئی ہے۔ کچھ لمبے بنچ اور چارپائیاں بھی ڈال دی گئی ہیں کھیل شروع ہونے میں چند منٹ باقی ہیں۔ پنڈال کے دروازے پہ ڈھول پیٹا جا رہا ہے۔ ایک مسخرہ مچان پہ ناچ رہا ہے ایک آدمی صندوقچی پاس رکھے ادھر ادھر ایک ایک آنے کے ٹکٹ فروخت کر رہا ہے۔ دری پہ تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ بنچوں اور چارپائیوں پہ لوگ بیٹھے اور لیٹے ہوئے ہیں۔

ماسٹر بجو کو ڈائرکٹر شہابو نے محض اس لئے ہیرو کا پارٹ دیا ہے،

کیونکہ ماسٹر بجو ڈائریکٹر کے بچوں کو کھلاتا رہا ہے۔ اس کے گھر کا سودا لاتا رہا ہے اور ہر روز اس کی مالش کرتا رہا ہے۔

مس چنچل تو شہابو کی خاص منظور نظر ہے۔ مس چنچل تھیٹروں کی مشہور اداکارہ ہے۔ وہ گنجی ہے مگر گھوڑے کے بالوں کی وِگ لگاتی ہے۔

پردہ اٹھتا ہے۔ بنیادی مرد جنہوں نے عورتوں کا لباس پہن رکھا ہے۔ گھوڑے کے لمبے لمبے بال لگائے ہوئے ہیں۔ چہروں پر سرخی پاؤڈر تھوپا ہوا ہے۔ حمد گاتے نظر آتے ہیں ؎

تو داتا ..... تو داتا

سب کا پالنہار، پالنہار..... سلامت۔ پردہ اگرتا ہے۔ پھر اٹھتا ہے تو سامنے بادشاہ کا دربار لگا ہوا ہے۔ لنڈے سے خریدی ہوئی تھی مرحوم شکاری کی پرانی برجس پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں باٹا کے سفید بوٹ ہیں کمر کے ساتھ لکڑی کی تلوار بندھی ہے گلے میں سبز منکوں کی مالا ہے۔ وہ بے چینی سے ٹہل رہا ہے۔ وزیر اعظم ساٹن کا پاجامہ، اور پشاوری چپل پہنے اندر آتا ہے۔ لمبے اور ہاتھ باندھ کر عرض کرتا ہے۔

وزیر:۔ مبارک ہو بادشاہ سلامت۔ خدا نے آپ کو لڑکی عطا کی ہے اور ..... شہزادی صاحبہ کی پیدائش پر رعایا کی طرف سے آپ کو مبارکباد پھولوں کا گلدستہ پیش کیا جاتا ہے۔

بادشاہ:۔ وزیر صاحب میں اپنی رعایا سے بہت خوش ہوں گل مجھے دیئے جائیں۔ اور دستہ رعایا کو واپس کر دیا جائے۔

ہاں! ذرا نجومی کو بلایا جائے۔

وزیر:۔ نجومی حاضر ہے۔

ایک بوڑھا کھوسٹ نجومی جس کا سر ہل رہا ہے اندر داخل ہو کر آداب بجا لاتا ہے۔

بادشاہ:۔ نجومی صاحب یہ بتایئے کہ شہزادی کا ستارہ کیا کہتا ہے۔

نجومی:۔ حضور جان بخشی ہو تو عرض کروں۔

بادشاہ:۔ ہاں ہاں! ۔ اے نجومی تمہاری جان بخشی کی جاتی ہے حال جو کچھ ہے سچ سچ بیان کر۔ سوچنے سے پہلے سب سود و زیاں بیان کر۔

نجومی:۔ بادشاہ سلامت اس لڑکی کی ریکھا یہ کہتی ہے کہ بڑی ہو کر یہ کئی گرم بازار عشق کا اور پہنے گی گلے میں اپنے یہ ہار عشق کا دنیا میں لوگ اسکے قصے بتائیں گے دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آئیں گے۔

بادشاہ:۔ بس بس۔ ایسی لڑکی کو جوان ہونے سے پہلے ہی موت کی نیند سلا دیا جائے۔ لکڑی کا صندوق فوراً تیار کیا جائے۔ اس میں اسکو ڈال دیا جائے۔

وزیر:۔ بادشاہ سلامت کچھ اور سوچا جائے۔

بادشاہ:۔ میرا حکم اٹل ہے۔

نجومی:۔ تو پھر شہزادی کی آئی اجل ہے۔

بادشاہ:۔ پردہ گرایا جائے۔

اس حکم کے ساتھ ہی پردہ بڑی مشکل سے گرتا ہے۔ گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھتا ہے۔ اس کے ساتھ لوگ بھی اٹھتے ہیں۔ گرد بیٹھتا ہے تو لوگ بھی بیٹھ جاتے

ہیں۔ دوسرا منظر اب یہیں شروع ہوتا ہے۔ دو ترکھان لکڑی کا صندوق بنا رہے ہیں۔

قائم :۔ دائم دین جلدی جلدی صندوق بناؤ۔ تاکہ ہم بھی اس بک بک سے نجات حاصل کریں۔

دائم :۔ لو بھائی صندوق تیار ہو گیا۔ آؤ اب شہزادی کو دریا میں پھینک آئیں۔

قائم :۔ جا تیرا خدا حافظ۔

دائم :۔ اخاہ! لو بھائی قائم اس دھوبی نے صندوق پکڑ لیا۔ لڑکی کے ساتھ دولت بھی پائی ہے۔

قائم :۔ بھائی دائم۔ یہ سب قسمتوں کے چکر ہیں۔ جب تقدیر دن پھیرتی ہے کسی رنجور کے۔ تو ہو جاتے ہیں کچے بیر بھی گچھے انگور کے۔

پردہ گرتا ہے

اب سسّی اس دھوبی کے ہاں پرورش پاتی ہے اور جوان ہو جاتی ہے۔ ایک دن ایک سہیلی اُسے پنّوں کی تصویر دکھاتی ہے سسّی جو پہلے ہی تیار بیٹھی تھی۔ ہزار جان سے پنّوں پر عاشق ہو جاتی ہے۔ اب وہ ہر روز تصویر کی پوجا کرتی ہے۔ ایک روز ڈائریکٹر شہا یو کی ہدایت کے مطابق ماسٹر بچو یعنی پنّوں جو کہ ایک شہزادہ ہے اپنے سپاہیوں کے ساتھ شکار کرتے کرتے سسّی کے لاجی باغ کی طرف آتا ہے۔ سسّی اُسے دُور سے دیکھتی ہے۔

سسّی :۔ ہیں! یہ تو میرے پنّوں کی تصویر اُسی کی تصویر!

پھر سپاہیوں کو روک کر کہتی ہے۔

سسّی :۔ ٹھہرو۔ تم اس طرح کھلم کھلا میرے باغ میں آنیوالے کون ہو؟

پنّوں :۔ اے معزز خاتون میں کیچ کا شہزادہ ہوں۔ اور میرا نام پنّوں ہے۔
سسّی :۔ پنّوں ! میرے خوابوں کی تعبیر پنّوں میری لکیر کا فقیر پنّوں ! خوش
رہو۔ خوش ہو سسّی کہ آج تیرے باغ میں بہار آئی۔ کر سجدہ کہ تیری دِلدار آئی۔
پنّوں :۔ یہ دیکھ رہی زمین پیار کر رہی ہیں ؟ تو ہے سسّی ! میری میٹھی لسی۔
سسّی :۔ ہاں تیری جان سسّی۔
پنّوں :۔ لاکھوں کروڑوں شکر ہے اس پروردگار کا جس نے یہ دن دِکھایا

بہار کا۔

سسّی :۔ پیارے پنّوں ! تو سفر کا تھکا ہارا ہے۔ ذرا آرام کر لے۔
پنّوں :۔ پیاری سسّی میری راحت تیرا دیدار۔ میرا آرام تیری میٹھی گفتار۔
سسّی :۔ تو پھر کیوں نہ ایک دوگانا گا لیں۔
پنّوں :۔ بسم اللہ کیجئے۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گاتے ہیں۔

تیری ذات ہے اکبری سروری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

پردہ گرتا ہے

پردہ اٹھتا ہے

پنّوں اور سسّی رات کو داد عیش دے کر آرام کر رہے ہوتے ہیں کہ پنّوں
کے بادشاہ کی طرف سے بھیجے ہوئے سپاہی اُسے مدہوشی کے عالم میں اٹھا کر
لے جاتے ہیں۔ سسّی کو ہوش آتا ہے تو وہ بستر خالی پا کر پنّوں کی جُدائی میں
یوں روتی ہے۔

ستی :۔ ہائے میرا پنّوں میرا میاں چھوڑ چلا گیا۔ اب میں بھی اپنے سینے مار کٹاری مرتی ہوں۔

ماں :۔ صبر کر بیٹی ۔

ستی : صبر! آہ صبر عاشقوں کیلئے حرام ہے جبر عشق کا غلام ہے جلم کا غلام ہے۔ اب جان ہتھیلی پہ رکھ کر میں بھی پنّوں کے پیچھے جاؤں گی ۔ جنگل میں لیلیٰ ہوتی ہے یا قتل شہید کہلاؤنگی ۔!

دوسری طرف پنّوں کو ہوش آتا ہے تو وہ حیران ہو کر چاروں طرف آنکھیں مل مل کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

پنّوں :۔ ہیں۔ اے کہیں گل اور ریت کے تھل ہیں کہاں میری ستی کہاں! تم کون ہو۔ ؟

سپاہی :۔ حضور! ہم آپکے غلام ہیں ہمیں بادشاہ سلامت نے آپکو لانے کیلئے بھیجا ہے۔ بادشاہ سلامت آپکی جدائی میں بےچین اور بےقرار ہیں ۔

پنّوں : نہیں نہیں — میں اپنی ستی کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا ۔

سپاہی : حضور اب آپ کو ستی کو بھلانا پڑیگا ۔ اور ہمارے ساتھ چلنا پڑیگا ۔

پنّوں : ہرگز نہیں ۔ اگر تم نے ضد نہ چھوڑی اس نہیں کے مضمون کی، تو..... مہندی ستی کے پاؤں کو لگے گی تمہارے خون کی ۔

سپاہی : سب یک تسان ہو کر پکڑ لو پکڑ لو ۔

پنّوں :۔ لیٹ جاؤ ۔

سپاہی :۔ آہ ! میں مر گیا ۔

پنّوں :۔ کافر، مکار، حرامزادے ۔!

لیکن اسی وقت جبکہ ماسٹر بچو پتوں بنا سپاہیوں کو ڈرا دھمکا رہا ہوتا ہے تو ایک تھانیدار پنڈال میں آتا ہے اور مونچھوں پہ ہاتھ پھیر کر ماسٹر بچو کو آواز دیتا ہے۔

تھانیدار۔ اوے بچو! کیا بک بک کر رہا ہے۔

ماسٹر بچو عرف پتوں فوراً ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے!

پتوں :۔ نوکر ہیں شاہ جی!

اور پھر اپنے پارٹ میں لگ جاتا ہے۔ پتوں لکڑی کی تلوار کے ایک وار سے سپاہی کو زخمی کرتا ہے۔ سپاہی زخمی ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا ہے۔ اور چیخ مار کر کہتا ہے۔

سپاہی :۔ آہ مار ڈالا پہلے شہابو نے پیسے نہ دے کر مارا تھا۔ اب ظالم بچو تو نے مار ڈالا ۔ (پھر کان پہ ہاتھ رکھ کر گانا شروع کر دیتا ہے)

جاؤں تو جاؤں کہاں گاؤں تو گاؤں کہاں

پردہ گرتا ہے

آخری سین میں پتوں کو سٹیج پہ ایک مصنوعی صحرا میں عربی لباس پہنا کے خاک اڑاتا دکھایا جاتا ہے۔ اچانک وہ ایک جگہ قبر پہ ایک آدمی کو فاتحہ پڑھتے دیکھتا ہے۔

پتوں :۔ ہیں۔ یہ قبر کس کی اور یہ فاتحہ پڑھنے والا کون؟ چند روز پہلے تو اس جنگل میں کوئی مزار نہیں تھا۔ کیوں بابا! یہ مزار کس بزرگ کا ہے۔؟

بابا :۔ اے نوجوان یہ بزرگ کا مزار نہیں بلکہ ایک کنواری لڑکی کی حسرتوں کا مزار ہے جو یہاں پتوں، پتوں پکارتی مر گئی۔

پنوں: (فاتحہ پڑھنے والے بابا کے سر پہ دوہتڑ مار کر) آہ! میری سسی مر گئی۔ آہ!
میری مٹھی سسی بہہ گئی۔ سلام اے بے وفا دنیا تجھے میرا آخری سلام۔
سسی! مت گھبرا۔ تو بہشت میں اکیلی نہیں رہ سکتی میں بھی آرہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی پنوں قبر پہ گرتا ہے۔ قبر پھٹتی ہے۔ اور پنوں سٹیج کے نیچے جا گرتا ہے جہاں سسی اس سے پہلے ہی بیٹھی مونگ پھلی کھا رہی ہوتی ہے۔ اوپر سٹیج پہ وہ عربی لباس والا بابا لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

عربی بابا: ظاہری آنکھ سے دُنیا کو دیکھنے والے لوگو! باطنی آنکھ کھول کر دیکھو۔
سچے عاشق معشوق بہشت میں جھولا جھول رہے ہیں۔

پردہ گرتا ہے اور حوریں گیت گا رہی ہیں۔

دِلا ٹھہر جا۔ یار دا نظارہ لین دے۔
او دِلا! ٹھہر جا.... ہائے دِلا ٹھہر جا......

پنڈال سے لوگ نکلتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو آوازیں دے کر گا رہے ہیں۔

او دِلا ٹھہر جا یار دا نظارہ لین دے
او دے۔ دِلا ٹھہر جا......

. . . .

گوریلے کا انجام

ہالی وڈ فلموں میں زپی نامی گوریلا نے تہلکہ مچا دیا۔ اس نے ہر فلم میں اپنی اداکاری سے بڑے بڑے ایکٹروں کو مات دے دی۔ زپی گوریلا کی موجودگی فلم کی کامیابی کی کلید تھی۔ جب فلم میں یہ گوریلا ہوتا وہ ہفتوں رش لیتی اور پروڈیوسر لاکھوں میں کھیلنے لگتا۔

لاہور کے فلمی حلقوں میں اس نادر گوریلا کی کامیابی اور اہمیت پہ عام گفتگو شروع ہو گئی۔ جیسے دیکھو ہالی وڈ کے گوریلا کے گن گا رہا ہے۔

"اجی اگر وہ گوریلا یہاں آجائے تو بڑے بڑے ایکٹروں کو فرش کر کے رکھ دے۔"

"واہ صاحب واہ! سالا کیا کام کرتا ہے۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری کو اس گوریلا کی انتہائی ضرورت ہے۔"

خدا بخش فلم پروڈیوسر نے زیپی گوریلا کی اتنی تعریف سنی تو بہ نفسِ نفیس ان کی فلم دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب وہ فلم دیکھ کر سنیما ہال سے باہر نکلا تو اس کے دماغ میں سوائے گوریلا کے کچھ نہ تھا۔ خدا بخش پروڈیوسر پاکستان کے ایکٹروں سے تنگ آچکا تھا۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ اس ملک کے ایکٹر سوائے گردنیں موٹی کرنے کے اور توندیں بڑھانے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ اس نے شدت سے اس بات کو محسوس کیا کہ اس ملک کی فلم انڈسٹری کو موجودہ مالی اور ذہنی بحران سے نجات دلانے کے لئے زیپی گوریلا کی سخت ضرورت ہے۔

خدا بخش نے دوسرے ہی روز ہالی وڈ والوں سے زیپی گوریلا کی بابت بات چیت شروع کر دی۔ ہالی وڈ والوں کیلئے زیپی گوریلا الٰہ دین کے چراغ کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اُسے کسی صورت سے اپنے سے جدا کرنے پر آمادہ نہ ہو رہے تھے۔ لیکن خدا بخش کے پاس روپیہ تھا، لاکھوں روپیہ تھا۔ اس نے زیپی گوریلا کے مالک کو دس لاکھ روپے کی پیش کش کی۔ اس شرط پر کہ زیپی خدا بخش کے پاس چار سال رہے گا۔ اس کے بعد اس کا مالک گوریلے کو واپس لے سکے گا۔ سودا طے ہو گیا۔ اور زیپی گوریلا لاس اینجلز سے ایک طیارے پر سوار کروا کر پاکستان کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

خدا بخش اپنے فلم یونٹ کے ساتھ کراچی کے اڈے پر زیپی گوریلا کے استقبال کے لئے پہلے ہی موجود تھا۔ جب گوریلا ایک ایئر ہوسٹس کی گود میں نیلے رنگ کا سوٹ پہنے سرخ ٹائی لگائے ہاتھ میں سگار لئے باہر نکلا ..... تو لوگوں نے خوش آمدید کے نعرے لگائے۔ زیپی گوریلا نے نیا ہیٹ فضا میں لہرا کر

ان کے سلام کا جواب دیا۔ اور اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے۔ اُسے کار میں بٹھا کر میٹرو پول ہوٹل لے جایا گیا۔ جہاں پہلے ہی سے اس کے لئے ایک خوبصورت کمرہ مخصوص کر دیا گیا تھا۔

گوریلا جب لاہور پہنچا تو اسٹیشن پر اس کے خیر مقدم کو اخباری نمائندوں کی پوری فوج موجود تھی۔ گوریلا نے مسکرا مسکرا کر ہر اخباری نمائندے کے سوال کا جواب دیا۔ مثلاً اس سے پوچھا گیا۔

سوال :- کیا آپ کو کراچی پسند آیا۔؟

جواب :- شہر اگرچہ چھوٹا ہے مگر وہاں کے لوگ بڑے کھلے دل کے مالک ہیں۔ میں نے ان میں اپنی جیسی بہت سی عادتیں پائی ہیں۔ بس تو ان میں بالکل اجنبیت محسوس نہیں کر رہا تھا۔"

سوال :- کیا سفر اچھی طرح کٹا۔

جواب :- یہ خاکسار تو سکاچ وہسکی پی کر سویا رہا۔ ہاں کبھی کبھی گرد نتھنوں میں گھس کر جگا دیتی تھی۔ آپ کے ہاں گاڑی بڑی تیز چلتی ہے۔ مگر سفر آہستہ آہستہ کٹتا ہے۔

لاہور کی فلم انڈسٹری میں نئے گوریلے کی آمد کی خبر آناً فاناً پھیل گئی۔ مہینہ بھر اس کی دعوتیں ہوتی رہیں۔ فلمی دنیا کے ہیرو اور ویلنوں کو فکر دامنگیر ہو گیا۔ کیونکہ نئے نے ایک کانفرنس میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ ہیرو کے علاوہ ویلن کا پارٹ بھی بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ وقت پڑنے پر ہیرو یا ہیروئن کے باپ کا کردار بھی خوش اسلوبی سے ادا کرے گا۔

خدا بخش نے منشی دھنی جھنگاوی سے خاص طور پر ایک کہانی زپی کے لئے لکھوائی۔ اور زپی گوریلے کے ساتھ چھانگا مانگا کے جنگلوں میں آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے نکل گیا۔ خدا بخش گوریلا کی صفات اور خصوصیات کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ یہ گوریلا بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ سب سے بڑی خوبی اس میں یہ تھی کہ وہ سیٹ پر چائے کم پیتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک بھی ایسا آدمی یا عورت نہ آتی تھی جس کے لئے خدا بخش کو وہسکی اور کھانے کا بندوبست کرنا پڑتا۔

۲۔ یہ کہ زپی گوریلا ایک بھی ری ٹیک نہیں دیتا تھا ۳۔ یہ کہ اُسے مکالمے زبانی یاد ہو جاتے تھے۔ ۴۔ یہ کہ وہ ایکسٹرا لڑکیوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اور ہیروئن سے یونہی دعا سلام سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ چھانگا مانگا کے جنگل میں زپی گوریلے نے اس غضب کا کام کیا کہ وہاں کے لوگ بھی عش عش کر اُٹھے۔ وہاں کے رکھوالوں نے کہا۔

خدا بخش جی! ہم نے اس جنگل میں کئی ایکٹروں کو کام کرتے دیکھا ہے۔ مگر اس گوریلے سے بڑھ کر اچھا کام آج تک کسی کو کرتے نہیں دیکھا۔

خدا بخش نے بہت جلد فلم مکمل کر لی اور عید پر ریلیز بھی کر دی فلم بے حد کامیاب ہوئی۔ لوگ سینما ہال پر ٹوٹ پڑے دو روپے کا ٹکٹ پانچ روپے میں بلیک ہونے لگا۔ خدا بخش کو لاکھوں کا نفع ہوا۔ اس نے ایک نئی کار خرید کر زپی کو دے دی۔ اور ساتھ ہی دوسری فلم کا اعلان کر دیا۔

زپی گوریلے کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔ لڑکیاں اُسے محبت بھرے خطوط لکھنے لگیں۔ اُسے ملک کی حسین ترین لڑکیوں کی طرف سے شادی

کے پیغامات وصول ہونے لگے۔ وہ جہاں جاتا لڑکیاں اور اس کے مداح اس کے آٹو لینے کیلئے اس پہ ٹوٹ پڑتے۔ نیکسی زپی گوریلا اپنی شہرت سے بالکل متاثر نہ ہوا کیونکہ یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے ہالی وڈ کی فضا میں اپنی شہرت کا چاند چمکتے دیکھا تھا۔

وہ لڑکیوں کو بھی محبت بھرے خطوں کے جواب نہ دیتا بلکہ سیکرٹری سے کہہ کر انہیں ایک لفظ ٹائپ کرواکر بھجوا دیتا۔ اکثر خطوط ردی کی ٹوکری میں پھنکوا دیتا۔ زپی گوریلا بڑا شریف النفس انسان اپنے اصول کا گوریلا تھا۔ تھا تو وہ بن مانس مگر حقیقت میں وہ بڑا بھلا مانس تھا۔ اس نے اپنے چند ایک اصول بنا رکھے تھے جس پہ وہ سختی سے عمل کرتا تھا۔ ان اصولوں کو اُس نے ایک چارٹ پہ لکھوا کر اپنی کوٹھی کے کمرے میں لٹکا رکھا تھا۔

اصول مندرجہ ذیل تھے :۔

(۱) صبح چھ بجے اٹھنا اور سیر کرنا۔ حوائج ضروری سے فارغ ہوکر کبھی گانا۔

(۲) ایک گھنٹہ ہارمونیم پہ ریاض کرنا۔

(۳) ایک ہزار ڈنٹر لگانا۔

(۴) ناشتہ کرکے شوٹنگ یا ریہرسل چلے جانا۔

(۵) پورے ایک بجے لنچ کرنا۔ لنچ سے پہلے تھوڑی سی فرانسیسی وائن پینا تاکہ معدے کا فعل ٹھیک رہے۔

(۶) لنچ کے بعد ایک گھنٹہ قیلولہ کرنا۔

(۷) قیلولے کے بعد پھر کام کرنا۔

(۸) شام کی چائے شیزان میں پینا۔

(۹) رات کا کھانا کوٹھی پر بالکل اکیلے کھانا اور کھانے کے ساتھ سکاچ وہسکی کے دو جام چڑھانا۔

(۱۰) رات کو روسی اور فرانسیسی ادب کی کتابیں پڑھنا اور سو جانا۔

(۱۱) کسی غیر عورت کی دعوت قبول نہیں کرنا۔

(۱۲) کسی پروڈیوسر کی گاڑی میں لفٹ نہیں لینا۔

ذبی گوریلا اپنی ان عادات کی وجہ سے فلمی حلقوں میں شریف آدمی کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس کی شہرت اس کے عمدہ کام اور بہترین ذاتی خصوصیات کی وجہ سے چاردانگ میں گونج اٹھی۔ اوپر تلے اس کی تین چار فلمیں کامیاب ہو گئیں بلکہ ان فلموں نے کامیابی کے ساتھ تمام سابقہ ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اس کی فلم پر سارا شہر ٹوٹ پڑتا۔ دوسری فلمیں دھڑا دھڑ ناکام ہونا شروع ہو گئیں ملک کے مشہور ہیرو اور ولینوں کی مارکیٹ گرنا شروع ہو گئی۔ خدا بخش کے علاوہ ہر پروڈیوسر، سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور کسی دوسرے کاروبار کے متعلق سوچنے لگا۔

تمام ایکٹروں نے اپنی میٹنگ بلائی اور اپنے مخدوش مستقبل کے متعلق غور و فکر کرنے لگے۔ آخر سب اس نتیجہ پر پہنچے کہ کوئی ایسا حل سوچا جائے جس سے ذبی گوریلے کی مارکیٹ ختم ہو جائے۔ کیونکہ اس جعلے مانس کی وجہ سے ان لوگوں کا رزق اٹھتا جا رہا تھا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ گوریلا کو کس طرح مات دی جائے۔ اُسے ہلاک کر دینا پاکستان کو دُنیا کی نظروں میں بدنام کرنے کے مترادف تھا۔ دُنیا کی حسین سے حسین عورت کی طرف گوریلا آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ شراب وہ بہترین

پیتا تھا اور خود پیتا تھا۔ پھر یہ مرحلہ کیسے طے ہو۔؟ آخر ایک بوڑھے اور جہاندیدہ ایکٹر نے چشمہ اتار کر صاف کرتے ہوئے کہا۔

"صرف ایک شے ایسی ہے جو زپی گوریلے کی بولتی بند کر سکتی ہے۔"

"وہ کیا۔؟"

سب نے ہم زبان ہو کر بے تابی سے پوچھا۔
بوڑھے نے ایکٹنگ سے انگلی اٹھا کر کہا۔

"چرس۔"

"چرس۔؟"

"ہاں چرس — اگر زپی گوریلے کو کسی طرح چرس کی عادت ڈال دی جائے تو سارا مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے گا۔"

اب سوال یہ پیدا ہو گیا کہ اُسے چرس کس طرح پلائی جائے۔ طے ہوا کہ گوریلا کی ایک دعوت کی جائے اور اس دعوت میں اسے ایک چرس کا سگریٹ بنا کر پیش کیا جائے۔

چنانچہ دعوت کا دن زپی گوریلے کی منظوری کے بعد طے ہو گیا۔ دعوت ایک عالیشان ہوٹل میں ہوئی۔ وہسکی، دال، مرغ، مچھلی اور جانے کیا کیا کھایا پیا گیا۔

آخر میں جس ایکٹر کے ذمہ یہ ڈیوٹی لگی تھی وہ زپی گوریلا سے باتیں کرتا اُسے چاندنی رات کا نظارہ دکھانے کے بہانے ہوٹل کی پچھلی گیلری میں لے گیا اور موسم کی بوقلمونیوں کی باتیں کرتے کرتے اُس نے چرس کا سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔

"حضور یہ سگریٹ تو ویسے عام سگریٹ ہے مگر اس میں جو شے بھری ہوئی ہے اسے زندہ دلانِ لاہور طلسم سامری کے نام سے اور یہ خاکسار سیرِ فلک کے نام سے یاد کرتا ہے حاتم طائی نے اسے ایک بار چکھا تھا اور ساری عمر "ایک بار پیا دوسری بار پینے کی ہوس ہے" کی گردان کرتا مر گیا۔

زبی گوریلے نے حیرت سے سگریٹ کی طرف دیکھا اور بڑی دلچسپی سے اُسے سلگا کر پینے لگا۔ گیلری میں کھڑے کھڑے وہ سارا سگریٹ پی گیا۔ مگر اسے کچھ نہ ہوا۔ ایکٹر کو ناامیدی ہوئی۔ لیکن جونہی زبی گوریلا پارٹی والے ہال میں آیا تو اُس کے جسم کے بال ایکدم کھڑے ہوگئے۔ گوڈیلے ایک بار چکرائے، گھومے اور آدیکو جو کے پاس بیٹھی ہوئی ہر عورت عریاں ہو کر رقص کرنے لگی۔ دماغ میں افریقہ کے جنگل اور حسین حسین گوریلائیں گھومنے لگیں۔ اُسے ہر بات پہ ہنسی آنے لگی۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر قہقہہ لگا کے ہنس پڑتا۔ پھر اس نے کھانا شروع کیا تو کھاتا ہی چلا گیا۔ ساری رات اپنے بستر پہ لیٹا سات آسمانوں کی سیر کرتا رہا۔ اور اُسے ہر لمحے کے بعد یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی اُسے بستر پہ سے اٹھا کر چھت کی طرف اُچھالتا ہے۔ اور بستر پہ گرا دیتا ہے۔ رات کے کسی لمحے وہ بستر پہ سے اٹھ کر سر کے بل چلنے لگا اور غسل خانے کے نل کے ساتھ لٹک کر دیر تک قلابازیاں لگاتا رہا۔ وہ خصوصیات جنہیں گوریلا ایکٹر بن کر بھول گیا تھا۔ چرس کے سگریٹ نے اس کا ماضی لا کر سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور اپنی جنگلی محبوبہ کی یاد میں چھم چھم رونے لگا۔

پھر وہ کمرے کے وسط میں اُلٹا لیٹ گیا.......... پھر

دھاڑیں مار مار کر پالی وڈ کی حسین عورتوں کو یاد کرنے لگا۔ پھر اُسی عالم میں فرش پہ ہی گر کر سو گیا۔

دوسرے روز اس کی آنکھ کھُلی تو اُسے یوں لگا جیسے وہ رات بھر جنّت کی سیر کرتا رہا ہو۔ اُسے اپنا آپ ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ اگرچہ اس کا انگ انگ دُکھ رہا تھا۔ شام ہوئی تو گوریلا نے غیر محسوس طور پہ اُسی سگریٹ کی طلب محسوس کی۔ اس نے فوراً سیکرٹری سے کہا برات والے بوڑھے ایکٹر کو فون کر کے بلا لیجئے۔ گوریلا نے تو داس ایکٹر سے فون پہ بات کی اور کہا۔

"طلسم سامری کا ایک پورا پیکٹ روانہ کر دیا جائے"

بوڑھے ایکٹر نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ اور فوراً دو پیکٹ چرس والے سگریٹ زپی گوریلا کو بھجوا دیئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ تاکید کر دی کہ ہر سگریٹ کے ساتھ کم از کم ایک پاؤ برفی ضرور کھائی جائے۔ اس سے سیر فلک کا مزہ دوگنا ہو جائے گا۔

زپی گوریلا نے باقاعدہ چرس پینا شروع کر دی۔ اس نے سکاچ کی بوتلیں باہر پھنکوا دیں۔ عورتوں کے عشقیہ خطوں کے جواب دینا شروع کر دیئے۔ سر کے بال بڑھا لئے۔ صبح گیارہ بجے تک سویا رہتا۔ جو سیکرٹری پہلے لوگوں کو خطوط لکھا کرتا تھا اب دن بھر زپی گوریلا کیلئے چرس کے سگریٹ بھرتا رہتا تھا۔ خدا بخش پروڈیوسر کی تو ہنسی گم ہو گئی۔ اس نے گوریلا سے چرس کے سگریٹ چھیننے کی کوشش کی تو زپی نے اُسے صاف کہہ دیا۔

مسٹر خدا بخش! اگر آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تو میں تم سے کنٹریکٹ منسوخ کر کے دوسرے پروڈیوسر کے پاس چلا جاؤں گا۔

خدا بخش سر پکڑ کر رہ گیا۔

ایک سال بعد زنبی گوریلا کا حالِ زبوں قابلِ دید تھا۔ خدا بخش نے اُسے جواب دے دیا تھا۔ اس نے دوسری جگہ کام شروع کر دیا۔ مگر اب وہ بات بات پر ری ٹیک کرواتا۔ مکالمے بھول جاتا۔ کھانا زیادہ کھاتا۔ چائے کے ستادن کپ پی جاتا۔ کھڑے کھڑے جھومنے لگتا۔ جھولتا جھولتا سو جاتا۔ ہر ایکسٹرا لڑکی سے پیار شروع کر دیتا۔ صرف دس روپے لینے پروڈیوسر کے دروازے پر صبح ہی سے جا کھڑا ہوتا۔

ان باتوں نے زنبی کی مارکیٹ ڈاؤن کر دی۔ پروڈیوسر نے اُسے فلموں میں کام دینا بند کر دیا۔ ایسی حالت میں زنبی گوریلا کیلئے زندہ رہنا اور جینا مشکل ہو گیا۔ یہ عالم دیکھ کر سیکرٹری نے جھک کر سلام کیا۔ اور پہلے ہوائی جہاز سے ہالی وڈ روانہ ہو گیا۔

آج کل زنبی گوریلا لاہور کے ایک سٹوڈیو میں زندگی کے باقیماندہ دن پورے کر رہا ہے وہ کوئی کام نہیں کرتا۔ ہر آدمی کے پاس جا کر ہالی وڈ کی باتیں سناتا ہے۔ اور آخر میں ذرا جھک کر کہتا ہے۔

"مولا! ایک چونی گولی کے لئے مل جائے"

. . . .

علی گنجے کی واپسی

پروڈیوسر علی گنجہ لنڈے بازار میں پکوڑے بیچا کرتا تھا۔ یہاں سے ترقی کرتے کرتے اس نے کبابوں کی دکان کھول لی۔ اس کے کباب علاقے بھر میں مشہور ہو گئے۔ علی گنجہ کباب والا ہر خاص و عام کی زبان پر تھا۔ جب اس کا بزنس مزید ترقی کر گیا تو کسی نے اُسے کہا۔

"علی گنجے جی! اگر کسی طرح آپ میکلوڈ روڈ پر دکان لے جائیں تو پھر پانچوں بارہ ہیں۔"

علی گنجے کی عقل موٹی تھی۔ چنانچہ اس کے دماغ میں یہ بات آگئی۔ اُس نے فوراً میکلوڈ روڈ پر دکان حاصل کرنے کیلئے تگ و دو شروع کر دی۔ آخر وہ ایک دوست کی وساطت سے کامیاب ہو گیا۔ اس نے اپنی دکان پر "علی گنجہ کباب والا" کا بورڈ لگوا دیا۔ اور کام شروع کر دیا۔

کوئی ایک سال کے بعد میلوڈرڈوسرے فلمی حلقوں میں علی گنجے کا نام مشہور ہو گیا۔
اور جب کا معیار کافی ترقی کر گیا اور علی گنجے نے سمن آباد میں "کباب منزل"
کے نام سے اپنا ایک مکان بھی بنوالیا۔ اُس کے اک دوست نے اُسے مشورہ دیا۔

"دوست اب وقت آگیا ہے کہ تمہیں ایک فلم کمپنی
سٹارٹ کرنی چاہیئے۔ کبابوں نے تمہیں اس مقام پہ
پہنچا دیا ہے جہاں سے فلم کا معیار شروع ہوتا
ہے۔ تم اتنے مشہور آدمی ہو گئے ہو کہ لوگ محض
تمہارے نام کی وجہ بار بار فلم دیکھنے آئیں گے۔ نیلو
اور رانی کو کوئی نہیں پوچھے گا۔"

علی گنجے کی موٹی عقل میں ایک بار پھر بات آگئی اور اس نے فلم
بنانے کا ارادہ کر لیا۔ سوال پیدا ہوا کہ فلم کیسی بنائی جائے۔ کامیڈی ٹریجڈی
تاریخی۔ جادو کی، لڑائی اور کٹائی کی یا جاسوسی۔ اس مقصد کیلئے علی گنجے
نے شہر کے ایک مشہور فلم اسٹوڈیو المعروف "شار فلمی سٹوڈیو" سے رجوع کیا۔ شار فلمی
سٹوڈیو کا دفتر لکشمی چوک ہی میں تھا۔ منیجر نے علی گنجے کی بڑی آؤ بھگت کی۔
اور پوچھا۔

"آپ کس قسم کا سکرپٹ چاہتے ہیں کیونکہ ہمارے یہاں جاسوسی، تاریخی،
جادوئی، جنگی، رومانٹک اور گھریلو غرضیکہ ہر قسم کا سکرپٹ آپ کو مل جائے گا۔"
علی گنجے نے کہا۔

"آپ کو تکلیف تو ہو گی لیکن سارے سکرپٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔"
منیجر نے سر کھجلا کر کہا۔

"پورے کا پورا سکرپٹ سنانا تو مشکل ہوگا۔ البتہ ہم آپ کو نمونے کے طور سکرپٹ کا ایک سین سنوا سکتے ہیں۔"
علی گنجے نے خوشی سے سر ہلا کر کہا۔

"منظور ہے۔"
منیجر نے گھنٹی بجائی اور چپڑاسی سے کہا کہ وہ مسٹر علی گنجہ کو ساتھ والے ڈیپارٹمنٹ میں لے جائے۔ یہ ڈیپارٹمنٹ جاسوسی فلموں کا سکرپٹ تھا۔
علی گنجہ کو دروازے کے اندر داخل کر کے چپڑاسی باہر نکل گیا۔ علی گنجہ جونہی اندر داخل ہوا اچانک پستول چلنے کی آواز آئی اور کسی نے قہقہہ مار کر علی گنجے کو پیچھے سے آکر پکڑ لیا۔
"ہاہاہا! اب قانون کے پنجے سے نکل کر تو کہیں نہیں جا سکتا۔ قانون اندھے کی لاٹھی ہے۔ اور یہ لاٹھی اس کی ہوتی ہے جس کی بھینس ہوتی ہے۔"
علی گنجے نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔
"لیکن حضور میرا کیا قصور۔"
کمرے میں اندھیرا تھا اچانک بتی جلی۔ روشنی میں علی گنجے نے دیکھا کہ اسکے ہاتھ پستول ہے اور اسکے سامنے فرش پر ایک لاش خون میں لت پت پڑی ہوئی ہے۔
پاس ہی ایک آدمی پولیس کی وردی پہنے کھڑا ہے۔ اس آدمی نے کہا۔
"تو قاتل ہے۔ قتل تو نے کیا ہے۔ کیونکہ پستول تیرے ہاتھ میں ہے اور لاش تیرے قدموں میں پڑی ہے۔"
"لیکن میں تو سکرپٹ......"

"ہاہاہا! سب جانتا ہوں کمینے! تو مجھے قتل نہیں دے سکتا قتل تو نے ہی کیا ہے۔ چلو بھاگ نے ......"

علی گنجے کو پسینہ آ گیا۔ اس کے بعد اچانک ایک آدمی مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا اور اُس نے مسکرا کر کہا۔

"کیوں جناب اگر آپ کی فلم کا یہ پہلا منظر ہو تو کیا رہے گا؟"
علی گنجے نے پسینہ پونچھ کر کہا۔
"مجھے سوچنے کا موقعہ دیا جائے"

اسکے بعد وہ جادوئی فلموں کے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوا لیکن ابھی وہ مشکل سے اندر ہی داخل ہوا تھا کہ ایک سیاہ پوش آدمی نے اُس کے سر پہ ڈنڈا مار کر اُسے بکرا بنا دیا۔ اور چنوں سے بھری ہوئی تھالی اُس کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

"لیجئے کھاؤ اور بھول جاؤ کہ کبھی تم بھی آدمی تھے اور کباب بنایا کرتے تھے۔"

علی گنجہ بکرا بنا کھڑا تھا اور تھوتھنی اٹھا کر رحم طلب نگاہوں سے سیاہ پوش آدمی کو دیکھ رہا تھا۔ آخر یہاں بھی اُسی منیجر نے آ کر اُسے رہائی دلوائی۔ اور اُسے پھر سے انسان بنایا۔ علی گنجے آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر تسلی کی، اور تاریخی کہانیوں کے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ یہاں ایک عربی چغے والے ڈیل ڈول آدمی نے تلوار اٹھا کر کہا۔

"مجاہدو! کیا ہوا تم مٹھی بھر ہو۔ کیا ہوا کہ دشمن کو دیکھ کر تمہاری ٹانگیں کانپنے لگیں، کیا ہوا کل سے تم نے کچھ نہیں کھایا۔ کیا ہوا تمہارے ہاتھوں میں تلواروں کی جگہ مسواکیں ہیں۔ لیکن تم فرزندانِ وطن ہو۔

وطن کی لاج اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اٹھو کپڑے اتار دو
مسواکیں منہ میں لے لو آنکھیں بنا دو غیظ و غضب سے سرخ
کر لو۔ اور دشمن پہ حملہ کریں۔ دشمن تمہارے سامنے بیٹھا مزے سے
میٹھا دیکھ رہا ہے۔ پہلے دس آنے والی کا اس کا صفایا کر دو اور
پھر ون ایٹ کی خبر لو۔ اور اس کے بعد گیلری والوں کا صفایا کر دو
مجاہدو! خبردار ایک بھی آدمی بچ کر سینما ہال سے باہر نہ نکلے۔

اس کے بعد مجاہدوں نے جو وہاں تعداد میں صرف چار تھے۔ علی گنجے پہ حملہ کر دیا۔
علی گنجہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر اس کمرے سے باہر نکل سکا۔ اس کے بعد
پیروڈیوسر علی گنجہ رومانٹک فلمی اسکرپٹ ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوا یہاں تازہ
تازہ پالش شدہ پلائی ووڈ کی گیلری کے پاس ایک فلمی جوڑا کھڑا باہر چاند دیکھ رہا تھا۔

لڑکا:۔ آہ! یہ کپڑے کے آسمان پہ ٹنگے ہوئے کاچاند کتنا پیارا لگ رہا ہے۔

لڑکی:۔ ہاں اور فضا میں پھیلی ہوئی وارنش اور رنگ و روغن کی بدبو کتنی بھلی
لگ رہی ہے۔

لڑکا:۔ آہ! اوپر آسمان کی طرف دیکھو۔ وہ اوپر مچانوں کے تختوں پہ بیٹھے ہوئے
کالے کالے نیم عریاں لائٹس مین ستاروں کی طرح حسین معلوم ہو رہے ہیں۔
آج میں کتنا خوش ہوں۔ آج مجھے میرے پیروڈیوسر نے میرے معاہدے کی
دوسری قسط ادا کر دی ہے۔

لڑکی:۔ اور میں بھی بہت خوش ہوں کہ آج میری نانی یعنی میری ماں میرے ساتھ
نہیں آئی۔ آج میں علی گنجے سے جی بھر کے پیار کی باتیں کر سکوں گی۔

لڑکا:۔ یہ علی گنجہ کون ہے۔؟

لڑکی :۔ میرا محبوب ۔

اس کے بعد لڑکی نے پلٹ کر علی گنجے کو دیکھا اور "پیارے علی گنجے" کہہ کر اپنی دونوں باہیں اُس کے گلے میں حمائل کر دیں علی گنجے نے بڑی مشکل سے اس بدصورت بیرونی سے نجات حاصل کی اور گھبرا کر کہانیوں کے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔ یہاں ایک لڑکی سے اُس کا اندھا باپ کہہ رہا تھا۔

"تو نے اپنے اندھے باپ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے رانی تو نے میری پگڑی اُتار کر میرے سر پہ جوتا پہنا دیا ہے۔ تو نے میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑا دیئے ہیں۔ تو نے میرا پنجرہ خالی کر دیا ہے۔ تو نے شیر اور بکرے کو ایک ہی گھاٹ پر پانی پینے پر مجبور کر دیا ہے۔ تو نے اُلٹے اُسترے سے مونچھیں مونڈ دی ہیں۔

اس کے بعد ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اور بڈھے کے قدموں پر گر پڑا۔

"اباجان مجھے اپنے قدموں میں جگہ دیجئے۔ میں آپ کے جوتے پالش کیا کروں گا۔ آپ کے ناخن اُتارا کروں گا۔ رات بھر آپ کے تلوؤں میں گدگدی کرتا رہوں گا۔ آپ کو جی بھر کر دباتا رہوں گا۔ میں آپ کا بھرکس نکال دوں گا۔ خدا کے لئے میرے ہاتھ میں اپنا پاؤں دیجئے۔"

بڈھے نے لات مار کر غصے سے کہا: "دور ہو نامنجاد۔ میں تیری ان چاپلوسیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ میں نے بھی دھوبی گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اندھا ہوں تو کیا ہوا۔ میرے دل کی آنکھیں تو کھلی ہیں۔ دل کی آنکھیں۔ اور اس کے بعد بڈھے نے اندھی آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے گانا شروع کر دیا۔

ہ دل کی آنکھیں کھلی ہیں میری پیا۔
تو دھیرے سے آجا ری انکھیں میں
نندیا آجا ری آجا۔
دھیرے سے آجا......

علی گنجے پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ اُس نے بھی ٹوپی اُتار کر زمین پہ پھینک دی۔ اور اندھے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر دل کی آنکھوں والا گیت گانا شروع کر دیا۔ اور یہی گیت گاتے ہوئے وہ دونوں سٹار فلمی سٹوڈیو سے باہر نکل گئے۔ اس کے بعد علی گنجے نے فلم بنانے کے ارادے سے توبہ کر لی۔ آج وہ پہلے کی طرح لنڈے بازار میں کباب لگاتا ہے۔ ایک اندھا سُرخ کوئلوں پر پنکھا مارتا رہتا ہے۔ جب کباب پک جاتے ہیں تو دونوں ساتھ مل کر کھاتے ہیں۔ اور رات گئے گاتے رہتے ہیں۔

ہ دل کی آنکھیں ہیں میری پیا
تو دھیرے سے آجا آنکھین میں
نندیا آجا ری آجا!.........

ستم کش چڑیاکوٹی

ستم کش چڑیاکوٹی کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کا خوب کھا پی رہا تھا۔ اُسے بچپن ہی سے شعر کہنے کا مرض تھا۔ ماں باپ نے بہتیرا علاج کرایا مگر مرض بڑھتا ہی گیا۔ تنگ آ کر ماں باپ نے ستم کش چڑیاکوٹی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب چڑیاکوٹی کا یہ حال تھا کہ اس نے سر کے بال بڑھا لیے۔ چہرے پر وحشت طاری کر لی۔ منہ میں ہر وقت پان اور انگلیوں میں سگریٹ رہنے لگا۔ بات کسی سے کرتا اور منہ کسی کا تکتا۔ ہر بات کے جواب میں اپنا کوئی نہ کوئی شعر چسپاں کر دیتا۔ چڑیاکوٹی پیدل چل کر شہر دہلی میں گیا۔

دلی آ کر اس نے ایک طوائف سے ملاقات کی پہلی ہی ملاقات میں طوائف کے حسن پر ایک فی البدیہہ نظم کہہ دی۔ در اصل یہ نظم کسی مشہور شاعر کی تھی جو ستم کش کو از بر تھی۔ طوائف نے ستم کش کو اتنی اجازت دے دی کہ وہ اُسکے گھر پہ پڑا رہے۔

ستم کش نے طوائف کے کوٹھے پر اپنا ٹھکانا بنا لیا۔ وہ اُسے غلط ملط غزلیں لکھ کر دیتا۔ تماشبین لوگوں کی آؤ بھگت کرتا۔ اُن کے کپڑوں پہ عطر لگاتا۔ موقع پاتے ہی کبھی کبھی ان کے گلے میں پھولوں کے ہار بھی ڈال دیتا۔ تماشبین ستم کش چڑیا کوٹی کے اس حسنِ سلوک سے بڑے متاثر ہوتے اور جاتے ہوئے کچھ نہ کچھ اُسے بھی دے جاتے۔ ستم کش چڑیا کوٹی کا بڑا اچھا گزارا ہو رہا تھا۔

لیکن ستم کش کے دل کی کلی مرجھائی ہوئی تھی۔ وہ ترقی کرنا چاہتا تھا۔ وہ آگے نکلنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ریڈیو پر اس کی غزلیں گائی جائیں۔ وہ فلم میں بھی گیت لکھے۔ اس کیلئے اسے طوائف کی امداد کی ضرورت تھی۔ اس دوران میں اس نے طوائف حسن آرا کو اپنی خوشامد اور حاشیہ برداری سے بڑا متاثر کر رکھا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے حسن آرا کو بڑے سبز باغ دکھائے۔ اس سے کہا کہ وہ کب تک کوٹھے پہ بیٹھی ٹھمریاں گاتی رہے گی۔ وہ زندگی میں آگے بڑھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی۔؟

اگر تم میرے ساتھ مل جاؤ تو ہم دونوں مل کر بڑا کام کر سکتے ہیں۔ بس تمہیں فلم کی ہیروئن بنا دوں گا۔ سارے ملک میں تمہارے نام کا ڈنکا بجنے لگے گا۔

حسن آرا، ستم کش چڑیا کوٹی کی باتوں میں آ گئی۔ ستم کش نے کیا کیا کہ دتی کے ایک نہایت شاندار ہوٹل میں آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر کی دعوت کی۔ کیونکہ وہ ریڈیو کو اپنی ترقی کا پہلا زینہ بنانا چاہتا تھا۔ ستم کش چڑیا کوٹی نے ہوٹل میں کافی شراب منگوا کر رکھ لی۔

اس رات حسن آرا بھی بڑی ٹھن کر آئی تھی۔ محفل سج گئی۔ جام پہ جام چلنے لگے۔

حسن آرا نے اس رات صرف مجرا ہی نہیں کیا بلکہ آل انڈیا ریڈیو کے گنجے ڈائریکٹر کی چندیا پر آنکھیں بند کر کے بوسے بھی دیئے۔ اور بعد ازاں ستم کش چڑیا کوٹی کو دوسرے کمرے میں بھیج کر ڈائریکٹر کی گنجی چندیا پر سر رکھ کر سو گئی۔ دوسرے روز ستم کش ڈائریکٹر سے ملنے آل انڈیا ریڈیو دلی کے دفتر پہنچ گیا۔ ڈائریکٹر نے ریڈیو پر ستم کش کی غزلوں کیلئے معاہدہ پیش کیا۔ تو ستم کش بولا۔

"حضور معاہدے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ صرف ایکبار میری غزل کسی سے گوادیں اور بس معاہدہ میں بعض دوستوں کی وجہ نہیں کرنا چاہتا۔"

ریڈیو ڈائریکٹر نے سوچا کہ چلو جب ایک شخص صرف ایک غزل پر ہی خوش ہے تو معاہدے کے جھنجٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے چنانچہ اسی روز شام کو ایک عورت نے دلی ریڈیو سے ستم کش چڑیا کوٹی کی غزل گا دی۔ اگرچہ معاہدہ نہیں کیا گیا تھا لیکن ریڈیو کی لاگ بک میں ستم کش کی غزل کی انٹری ہو گئی تھی۔

اگلے روز ستم کش چڑیا کوٹی نے ایک وکیل سے مل کر آل انڈیا ریڈیو کو نوٹس دے دیا کہ وجہ بتائی جائے کہ اس نے جو اسکی غزل بغیر کسی معاہدے اور اسکی اجازت کے ریڈیو پر گوادی ہے تو اس پر کیوں نہ عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ ستم کش نے دس ہزار روپے کا ہرجانہ کا دعویٰ کر دیا۔

ریڈیو والے پریشان ہو گئے۔ غزل واقعی بغیر معاہدے کے گوائی گئی تھی اور لاگ بک میں اس کی انٹری بھی موجود تھی۔ مقدمہ شروع ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریڈیو والے مقدمہ ہار گئے اور ستم کش نے دس ہزار روپے ہرجانے کے وصول کر لئے۔ دس ہزار روپے اور حسن آرا کو لیکر بمبئی آ گیا۔ یہاں اس نے ایک انتہائی قیمتی

ہوٹل میں ڈبل روم کرائے پہ لے لیا۔ دونوں نے بہترین کپڑے بنوائے۔ ایک گاڑی جو بیس گھنٹے نیچے کھڑی رہتی۔ ستم کش نے بڑے بڑے فلمی لوگوں کو ہوٹل میں دعوتیں کرنی شروع کر دیں۔

حسن آرا نے فلمی سیٹھوں کو رام کرنا شروع کر دیا۔ ستم کش نے دو مزید خوبصورت لڑکیوں کا تعاون حاصل کیا۔ چنانچہ ایک ماہ کے اندر ہی امدراس نے بیک وقت تین فلمیں بنانے کا اعلان کر دیا۔ ایک کاسٹیوم فلم ایک پنجابی فلم اور ایک سوشل فلم تھی۔

ان میں سے کاسٹیوم فلم کامیاب ہوگئی۔ ستم کش چڑیا کوٹی نے کاسٹیوم فلمیں ہی بنانا شروع کر دیں۔ اب چونکہ ایک کاسٹیوم فلم کامیاب ہوگئی تھی۔ اس لئے مارکیٹ میں ہر طرف کاسٹیوم ہی فلمیں بننے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے کاسٹیوم فلموں کو بھی ناپسند کرنا شروع کر دیا۔

اتفاق سے ایک سوشل فلم کامیاب ہوگئی۔ اب ہر طرف سوشل فلموں کے لئے دوڑ دھوپ شروع ہوگئی۔ ستم کش نے بھی دو سوشل فلمیں شروع کر دیں۔ فلم دیکھنے والوں کے سر پھر گئے۔ وہ سوشل فلم کو پسند کرتے تو ان کے سر پہ دھڑا دھڑ سوشل فلموں کے ہتھوڑے چلنے لگتے۔ وہ کاسٹیوم فلموں کے دامن میں پناہ لیتے تو کاسٹیوم فلموں کے ڈونگرے برسنے شروع کر دیں۔ وہ کپڑے پھاڑ کر، سیاں توڑ کر سنیما گھروں سے بھاگ اٹھے۔

ستم کش چڑیا کوٹی نے اپنا بہت بڑا دفتر بنا لیا۔ فلمیں بنانے کا اسے ہلکا کام معلوم ہونے لگا۔ اس نے سمگلنگ کا کام بھی شروع کر دیا۔ اس کام

میں وہ ایک دن میں لاکھوں کما لیتا۔ وہ ریس کھیلتا۔ شراب میں وہ دن بھر دھت رہتا۔ اپنے دوستوں کو اور ان لوگوں کو جنہوں نے شروع شروع میں اسکی مدد کی تھی گالیاں دیتا۔ کئی نئی لڑکیوں کو ہیروئن بنانے کا جھانسہ دے کر اُن کی جوانی سے کھیلتا۔ اور پھر اٹھا کر انہیں باہر پھینک دیتا۔

ایک روز اُس کی پہلی معاون حُسن آرا طوائف اُس سے ملنے آئی۔ اُس کے جھریاں پڑ گئی تھیں۔ وہ بدصورت اور بڈھی ہو رہی تھی۔ مگر ستم کش نے اُسے منہ نہ لگایا۔ اور دھکے مار کر دفتر سے باہر نکال دیا۔

حُسن آرا گمنامی اور کسمپرسی کے عالم میں اس دُنیا سے رخصت ہو گئی۔

ستم کش چڑیا کوٹی اب لاکھوں کا آدمی ہے۔ لاہور، کراچی میں اُسکے شاندار دفتر ہیں۔ وہ ہوائی جہاز پہ سفر کرتا ہے۔ اس کی شیروانی کا ہر بٹن دس ہزار روپے کی مالیت کا ہے۔ پچھلے دنوں جب وہ لاہور آیا تو اُس نے یونہی محفل پہ رُعب ڈالنے کے لیے اپنی شیروانی کے دو بٹن فروخت کر کے ایک شاندار کار خریدی۔ اس کا اپنا سر پھر چکا ہے۔ اُسے آدمی چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں۔ اُسے ریس کے گھوڑے اور گمریاد کتے انسانوں سے زیادہ عزیز ہیں۔ اب اُسے کبھی بھی خیال نہیں آیا کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ دلی کی ایک طوائف کے کوٹھے پہ تماشبینوں کو عطر لگایا کرتا تھا اور اُن کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالا کرتا تھا۔

. . . .

دکھیا خانم گجراتی کے دو خط

پہلا خط

میرے پیارے خرگوش کمار!

میرا سلام محبت قبول کرو۔ اوّل تو تمہیں میرا خط پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ ایک نظر لفافے پر ڈال کر اُسے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دوگے۔ تمہیں خبر بھی نہ ہوگی کہ اِس لفافے کے اندر تمہاری ایک پرستار لڑکی کا معصوم دل دھڑک رہا ہے۔ اور نوکر ٹوکری اٹھا کر باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پہ پھینک دے گا۔ اور اگر میری قسمت نے یاوری کی اور تم نے خط کھول کر پڑھ بھی لیا تو تم اُسے محض ایک بیوقوف لڑکی کی بے معنی بکواس سمجھ کر اُسے پھاڑ دوگے۔

لیکن میرے پیارے خرگوش کمار جی! میرے دل میں جو تمہارے لئے محبت کا جذبہ موجزن ہے۔ اس کا مقابلہ بحرالکاہل کا سمندر بھی نہیں کر سکتا۔ میں پہلے اپنا تعارف کرادوں۔ میں گجرات میں اپنے ماں باپ کے پاس رہتی ہوں۔ اور نویں جماعت میں تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔ گھر والے یوں مجھ سے بڑا پیار کرتے ہیں۔ مگر ان ظالموں نے مجھے بے بس پرندے کی طرح گھر کی چار دیواری میں قید کر کے رکھ چھوڑا ہے۔ سوائے سکول جانے کے اور سیدھی گھر آجانے کے اور کسی جگہ جانے کی اجازت نہیں۔ گھر میں ہر کوئی نماز پڑھتا ہے۔ اور زبردستی مجھے بھی نماز پڑھوائی جاتی ہے۔ سینما کا نام لوں تو سب کے چہرے بدل جاتے ہیں۔

پھر بھی خرگوش کمار جی! میں اپنی سہیلی کے ساتھ چھپ چھپا کر تمہاری فلم دیکھ لیتی ہوں۔ کیونکہ تمہاری فلم دیکھنا اور اس فلم میں تمہیں مسکراتے، باتیں کرتے، ہنستے، روتے، محبت کرتے اور گھوڑا دوڑاتے دیکھنا میری عبادت بن کر رہ گیا ہے۔ میں نے پہلی بار تمہیں "سخی لٹیرا" میں دیکھا۔ اور تم نے میرا صبر و قرار چھین لیا۔ تمہاری چمکدار آنکھیں گھنگریالے بال، موٹی موٹی گردن اور عورت کے سامنے کھڑے ہو کر شرمانے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میں اپنا دل تمہارے قدموں پہ لٹا بیٹھی۔ دل و جان سے تم پہ عاشق ہو گئی۔ تمہارے نام کی مالا جپنے لگی۔ اب میں سارا دن سکول میں بیٹھی تمہارے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ رات کو تمہارے خواب دیکھتی ہوں پھر کو تمہارے تصوّر کو دماغ میں سجا کر سو جاتی۔ میں نے تمہاری ایک تصویر ایک

رسالے میں سے کاٹ کر اپنی الماری میں کتابوں کے نیچے چھپا کر رکھ لی۔ صبح اٹھ کر تصویر دیکھی، اور رات کو سونے سے پہلے اس کے درشن کرتے کبھی نہیں بھولتی۔ میرا خیال تھا کہ یہ عشق آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔ یا کم از کم ایک ہی سطح پر رہے گا۔ لیکن اس نے ترقی کرنی شروع کر دی۔ اور اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ نہ دن کو چین ہے اور نہ رات کو قرار ہے۔ پڑھائی میں جی نہیں لگتا۔ ہفتے میں دو تین بار اپنی سہیلیوں کے ساتھ سکول سے بھاگ کر فلم دیکھتی ہوں۔ ہر وقت ٹھنڈی آہیں بھرتی ہوں۔ کوئی تمہارا نام لیتا ہے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ کبھی تمہاری تصویر دیکھتی ہوں تو دل تھام کر رہ جاتی ہوں۔ کسی سے بات نہیں کرتی۔

دو روز بخار میں پڑی رہی۔ اور بے ہوشی میں تمہارا نام لے لے کر تمہیں بلاتی رہی۔ ماں باپ کو پتہ چل گیا۔ انہوں نے مجھے اتنا مارا کہ میرا جسم زخمی ہو گیا۔ لیکن ....

۵ نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

محبت تو لافانی ہوتی ہے۔ جب ایک بار کسی سے سچا عشق ہو جاتا ہے تو پھر انسان کو سوائے اپنے محبوب کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ جس طرح ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے۔

میرے پیارے خرگوش کیا کہوں اب تو تمہارے عشق میں اندھی ہو گئی ہوں۔ مجھے سوائے تمہارے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ

گجرات کو، اپنے گھربار کو اپنے ظالم ماں باپ کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہارے پاس آجاؤں ۔ اور ساری زندگی تمہاری لونڈی بن کر گزار دوں۔

پیارے خرگوش جی! میں تمہاری خدمت کروں گی۔ تمہارا جھوٹا کھا کر گزارہ کر لوں گی۔ تم جو پہناؤ گے ہنسی خوشی پہن لوں گی۔ مگر تمہارے در سے کبھی نہیں ہلوں گی۔ بس میرا اٹل فیصلہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور مسرت صرف تمہارے قدموں میں میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں آ رہی ہوں۔ آ رہی ہوں، آ رہی ہوں ......

ہمیشہ تمہاری لونڈی
رکھیا خانم گجراتی

دوسرا خط

میری پیاری سہیلی اکبری!

خدا تمہیں سلامت رکھے اور کبھی لاہور کی فلم انڈسٹری کا منہ نہ دکھائے اگرچہ اس بات کو پانچ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن پھر بھی تمہیں یاد ہوگا کہ تم نے روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مجھے گاڑی میں سوار کروا دیا تھا میں اس دن اپنے ماں باپ کے گھر کو، اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر اپنے محبوب خرگوش کمار سے ملنے گھر سے بھاگ کر جا رہی تھی تمہیں کتنا دکھ ہو رہا تھا۔ اپنے ماں باپ کو چھوڑنے کا صدمہ مجھے بھی تھا۔ مگر اس سے

زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ میں لاہور جا کر اپنے سپنوں کے شہزادے خرگوش کمار کا دیدار کر سکوں گی۔ اور پھر میں تو اس کے ساتھ ہی باقی زندگی بسر کرنے کا پروگرام بنا کر جا رہی تھی۔

میں شام کے وقت لاہور پہنچی۔ اس وقت سردی ہو رہی تھی۔ اور لاہور کے بازاروں میں دھواں اور دھند پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اسٹیشن سے باہر آکر ٹیکسی لی، اور سیدھا خرگوش کمار کی کوٹھی میں پہنچ گئی۔ خرگوش کمار مجھے دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہ اس وقت کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ میں تو اس کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ فلم والے خرگوش کمار میں اور اصل خرگوش کمار میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً اصلی خرگوش کمار کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے دانت زیادہ پان کھانے کی وجہ سے بڑے گندے ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ کچھ گنجا بھی ہو رہا تھا۔ سر میں کچھ بال سفید بھی تھے پھر بھی میرے عشق میں کوئی کمی نہ آئی۔ میں اُسے پاگل بلبل کی طرح دیکھتی رہی۔ اور خوش ہوتی رہی۔

خرگوش نے بڑی محبت سے کہا۔

" ڈکھیا خانم تم بڑی خوبصورت لڑکی ہو۔ "

میں شرما گئی۔ خرگوش کمار نے میرے گلے میں اپنا بازو ڈال دیا اور میرا منہ چوم لیا۔ مجھے گویا دونوں جہانوں کی دولت مل گئی۔ اسکے بعد خرگوش کمار نے الماری میں سے شراب کی بوتل نکالی، اور گلاس میں ڈال کر

پینے لگا۔ میں سہم گئی۔ خرگوش کمار نے مسکرا کر کہا۔

"میری جان یہ تو عاشقوں پر حلال ہے۔ لو تم بھی چکھو۔"

میں نے انکار کر دیا۔ خرگوش کمار برابر شراب پیتا رہا۔ جب شراب کے نشے میں مگن ہو گیا تو اُس کی صورت بگڑ گئی۔ آنکھیں انگارہ ہو گئیں۔ چہرے سے وحشت برسنے لگی۔ اس نے مجھے مُسکرا کر دیکھا۔ اور مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ میں نے بھاگنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ خرگوش کمار نے سب دروازے اندر سے بند کر رکھے تھے۔ چنانچہ اس نے میری عصمت برباد کر دی' اب میں شریف زادی نہیں رہی تھی۔ میں ساری رات روتی رہی۔ اور خرگوش کمار میری عصمت برباد کرتا رہا۔

•

دوسرے روز اس نے پھر وہی حرکت کی' میں بے بس تھی۔ گھر واپس نہیں جا سکتی تھی۔ اس کے بعد کوئی دو مہینے اس نے مجھے اپنے پاس رکھا اور مجھے پوری طرح تباہ کر دیا۔ اور پھر ایک روز یہ کہہ کر ایک آدمی کے ساتھ مجھے چلتا کر دیا کہ ـــ

"کوہ مری سے میری بیوی واپس آ رہی ہے تم کچھ روز میرے دوست کے پاس رہو۔ میں تمہیں وہاں آ کر مل جایا کروں گا۔"

خرگوش کمار کا دوست مجھے اپنے ساتھ ایک گندے فلیٹ میں لے گیا۔ اس بدبخت شخص نے کوئی دو مہینے اس گندے فلیٹ میں رکھا۔ اور فلم میں ہیروئن بنانے کا جھانسہ دے کر مجھے گناہ آلود زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا رہا۔ اِسی

طرح ایک سال گزر گیا۔ مجھے اس دوران میں ایک فلم میں چھوٹا سا رول ملا۔ اس رول کے لیے مجھے ایکسٹرا سپلائر سے لے کر کیمرہ مین اور ڈائریکٹر اور پروڈکشن کنٹرولر تک کے ہاں ایک ایک رات بسر کرنی پڑی۔

اب یہ ہوتا تھا کہ جب فلم میں کبھی مجھے چھوٹا سا کام ملتا مجھے ایک ایک رات فلم کے ہر آدمی کے پاس بسر کرنی پڑتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں فلمی بازار کی ایک رنڈی بن کر رہ گئی۔ میں نے کئی فلموں میں چھوٹا موٹا کام کیا۔ اور ہزاروں راتیں مجھے دوسرے لوگوں کے ساتھ بسر کرنی پڑ گئیں۔

پیاری بہن! اب میں گھر واپس آنے کے قابل نہیں ہوں لیکن اس قابل ضرور ہو گئی ہوں کہ میں ایک کامیاب اداکارہ بن سکوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اب مجھ میں وہ ساری صلاحیتیں پیدا ہو چکی ہیں جو ایک اعلیٰ اور کامیاب ایکٹرس بننے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ مثلاً میں صوفے پہ ٹانگیں پھیلا کر سگرٹ پی سکتی ہوں، غیر مردوں کے سامنے بیٹھ کر قہقہے لگا سکتی ہوں۔ کوئی میرا بوسہ لے تو مجھے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔ جیسے کوئی کسی دیوار پہ ہاتھ رکھ دے میری آنکھوں کی شرم مر گئی ہے۔ جسم کی بے حیائی پوری طرح زندہ ہو گئی ہے۔ ضمیر سو گیا ہے۔ مکاری بیدار ہو گئی۔ سینہ ڈھلک گیا ہے۔ مگر میں نے اُسے مصنوعی سہاروں سے پہلے سے بھی زیادہ اونچا کر لیا ہے۔ میں پتھر کی سِل بن گئی ہوں قلمی بنیے کی دکان کے باہر رکھا ہوا نمک کا ڈلا بن گئی ہوں جسے کوئی سانڈ بھی آ کر چاٹ سکتا ہے۔

مجھے گجرات کا اپنا چھوٹا سا سکول اور گھر اور ماں باپ بڑے یاد آتے

ہیں۔ مگر میں ایسا نہیں اتنا پیچھے چھوڑ آئی ہوں کہ اگر واپس ان کی تلاش میں نکلوں تو مجھے یقین ہے کہ راستے میں ہی میری زندگی کی شام ہو جائے گی۔ تم نے یقیناً دسویں پاس کر لی ہوگی۔ اور تمہاری شادی کی فکر ہو رہی ہوگی۔ خدا کرے کہ تمہارا بیاہ ہو جائے اور تم اپنے معصوم بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہو۔ اور مجھے وہ نیم برقع پوش بھولی بھالی لڑکی بہت یاد آتی ہے جو صبح صبح سکول جایا کرتی تھی۔ اور جس کی انگلیوں پہ سیاہی کے دھبے ہوا کرتے تھے۔ اب اس لڑکی کے ناخنوں پہ نیل پالش رہتا ہے۔ وہ ان انگلیوں پہ عیاش مردوں کو تگنی کا ناچ نچایا کرتی ہے۔ خدا حافظ

تمہاری سہیلی

دکھیا خانم گجراتی مرحوم

جانوروں کا فلمی ایوارڈ

عیدگاہ کے وسیع میدان میں شامیانے لگے ہیں۔ جھنڈیاں رنگ برنگی لہرا رہی ہیں۔ برقی قمقموں نے سارے پنڈال کو بقعۂ نور بنا رکھا ہے۔ کرسیاں بچھی ہیں۔ ان کرسیوں پر اپنی اپنی حیثیت کے مطابق گھوڑے۔ خچریں، بطخیں، بیل، بھینسیں، گائیں۔ نیولے، چوہے، خرگوش، بکریاں۔ بکرے، دُنبے براجمان ہیں۔ ہر جانور زرق برق لباس میں ملبوس ہے۔ کوئی سگار پی رہا ہے کوئی سگریٹ منہ میں دبائے ہوئے ہے کسی نے وسکی پی رکھی ہے اور کسی نے بیئر چڑھائی ہوئی ہے۔ کوئی چرس پی کر آیا ہے، کوئی پینے والوں میں بیٹھ کر آیا ہے۔ اور نشے میں جھوم رہا ہے۔ آخر کیوں نہ ہو آج اُن لوگوں کو جو فلمی دُنیا کے مایۂ ناز ستارے ہیں فلمی ایوارڈ مل رہا ہے۔ اس ایوارڈ کی تقریب کا انتظام محکمۂ پرورشِ حیوانات کی طرف سے

کیا گیا ہے جب سے اِس محکمے کو اطلاع ملی ہے کہ کچھ جانور بھی فلمی دُنیا میں جا کر فن کی خدمت کر رہے ہیں، اس محکمے نے ان کی حوصلہ افزائی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ فلمی ایوارڈ کی تقریب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اِس اجتماع میں ایکٹرسیں بھی ہیں اور ایکٹر بھی ڈائرکٹر بھی ہیں، اور کہانی نویس و مکالمہ نویس بھی۔ سٹیج پر بڑی روشنیاں ہو رہی ہیں اور پردے کے وسط میں ایک بہت بڑے ریچھ کا سر بنا کر لٹکا رکھا ہے۔ یہ ایوارڈ دینے والوں کا حکمائی نشان ہے۔ یہ سر ایک ایسے مشہور و معروف فلم ایکٹر کا ہے، جو ایکٹنگ کرنے، عورتوں کو بھاگنے، شراب پینے اور لوگوں کا پیچھا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ ٹھیک نو بجے شب جلسے کی کارروائی شروع ہو گئی۔ پردہ اٹھا اور سٹیج پہ ایک اُونٹنی بڑی بنی سنوری آئی۔ اُس نے گردن جھکائی اور حاضرین کو سلام کیا۔ اور طبلے کی تھاپ اور گھنگروؤں کی جھنکار پہ رقص کرنا شروع کر دیا۔ یہ اونٹنی فلم انڈسٹری کی ایک اعلیٰ پیمانے کی رقاصہ تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کی ایک بھی کل سیدھی نہیں تھی۔ آنکھیں اور ناک ایک ساتھ ٹیڑھی تھیں۔ کمر کا کوہان باہر کو نکلا ہوا تھا۔ سینہ آگے کو نکلتا چلا گیا۔ وہ سٹیج پر ٹانگیں چلاتے ہوئے رقص کر رہی تھی۔ کبھی گردن کو ہلا دیتی۔ کبھی ٹانگ اٹھا کر سر پہ رکھ لیتی۔ کبھی سر جھکا کر ٹانگوں میں دے دیتی۔ کبھی کمر کا کوہان مٹکا مٹکا کر حاضرین کے صبر کا امتحان لیتی۔ کبھی تھوتھنی آگے کو پھیلا کر ہوا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کرتی۔

حاضرین دم بخود بیٹھے تھے۔ اونٹوں کی قطار میں ایک نوجوان اونٹ ....

بے اختیار بلبلا اُٹھے۔ اور اپنی گردنیں اٹھا کر لہرانی شروع کر دیں۔ گدھوں والی
کرسیوں کی قطار میں دو تین گدھے ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگے۔ ایک نیولا
اس اونٹنی کا کوہان دیکھ کر غش کھا کر گر پڑا۔

رقص ختم ہوا تو ایک بوڑھا بیل آنکھوں پہ عینک لگائے گنجے سر پہ ہاتھ
پھیرتا دوسرے ہاتھ میں کاپی پکڑے آیا۔ اور بولا۔

معزز مادہ و نر جانور حضرات

ہمیں خوشی ہے کہ اس تقریب سعید پہ جناب ہاتھی کاکوروی نے
ہمارا دعوت نامہ قبول کر کے صدر بننے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اب
میں جناب ہاتھی صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کرسیٔ صدارت
پہ براجمان ہوں۔ اور انعامات تقسیم کریں۔

ایک جھرجھری لیتا ہوا ہاتھی اٹھا اور جھولتا جھالتا اسٹیج پہ آیا۔ اور اپنی سونڈ
ہلا کر سب کو سلام کیا۔ اور کرسیٔ صدارت پہ بیٹھ گیا۔ بیل نے جو اسٹیج سیکرٹری
تھے اعلان کے ساتھ بہترین ہیروئن کو انعام دینے کے لئے سر ہلایا۔

"بہترین ہیروئن مس لومڑی جان"

ایک لومڑی اسٹیج پہ مٹکتی آ گئی۔ سب جانوروں نے تالیاں بجائیں۔
لومڑی جان نے کالا چشمہ لگا رکھا تھا۔ بال انگریزی فیشن پہ کٹے ہوئے تھے۔
ہونٹوں پہ نیلے رنگ کی لپ اسٹک تھی۔ ہاتھ میں سنہری پرس تھا۔ اسٹیج سیکرٹری
نے جناب ہاتھی کو ایوارڈ کا بت دیا۔ یہ بت ایک چھوٹے سے ریچھ کا مجسمہ
تھا۔ صدر نے اُٹھ کر ریچھ کا مجسمہ مس لومڑی جان کو پکڑا دیا۔ سب جانوروں

نے تالیاں بجائیں۔ مس لومڑی اپنے تیکھے دانت نکال کر ہنسنے لگی، اور ساتھ ہی مکّار آنکھیں سکوڑ کر غرانا شروع کر دیا۔ سٹیج سیکریٹری نے اُن کی تعریف میں کہا۔

"حاضرین! مس لومڑی کو یہ ایوارڈ فلم "جنگل کا سوداگر" نامی فلم میں کام کرنے پر دیا گیا ہے۔ اس فلم میں مس لومڑی نے ایک عیاش آوارہ عورت کا پارٹ اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ نقل میں اصل کا شبہ ہوتا ہے۔"

اب بہترین ہیرو کا انعام جناب خچر صاحب کو دیا جاتا ہے۔ میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ سٹیج پر تشریف لا کر انعام حاصل کریں۔

خچروں کی قطار میں سے ایک خچر صاحب جن کے بال گردن تک بڑھے ہوئے تھے۔ کالا چشمہ لگائے منہ پر لگا ہوا سرخی پاؤڈر پیا یا پسینہ رومال سے پونچھتے اٹھے اور سٹیج پر آ گئے۔ انہوں نے انعام لیا تو حاضرین نے نعرے لگائے۔

"خچر ہیرو زندہ باد ....

سٹیج سیکریٹری نے ان کی تعریف میں کہا۔

جناب خچر صاحب کو یہ انعام ان کی بہترین فلم "دلا کھاڑ" پر دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ شرمیلے واقع ہوئے ہیں۔ ایک نظر میں انہوں نے ایک دیہاتی خچر کا رول بڑی کامیابی سے ادا کیا ہے۔ سب سے بڑی خوبی آپ میں یہ ہے کہ آپکی جنس کے بارے میں ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکی۔ کوئی انہیں مرد سمجھتا ہے اور بہت سے انہیں عورت سمجھتے ہیں۔ عورتوں کی طرح چلتے ہیں۔ مردوں کی طرح کام

کرتے ہیں۔ عورتوں کی طرح مردوں سے بات کرتے ہیں۔ اور مردوں کی طرح عورتوں کا پیچھا کرتے ہیں۔

" اپنی تعریف سن کر خنجر شرم سے عرق عرق ہو گیا۔ اس نے رومال نکال کر بار بار اپنی لمبی تھوتھنی پونچھنا شروع کر دی۔ پھر وہ بھی سٹیج پہ تشریف لے گئے۔ اب بہترین ویلین کو سٹیج پہ بلایا گیا۔ سیکرٹری نے اعلان کیا۔

" اب اس سال کے بہترین ویلین جناب بھینسا صاحب تشریف لاتے ہیں۔ آپ کو ان کی بہترین فلم "لڑاکا شہسوار" پہ انعام دیا جا رہا ہے۔

بھینسوں کی قطار میں سے ایک موٹا تازہ بھینسا گھوں گھوں کرتا۔ ناک چڑھاتا۔ تھوتھنی گھماتا، دُم اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر کرسیوں پہ مارتا ہوا۔ اور سٹیج پہ دو تین بار اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور سر جھکا کر، کھُر جوڑ کر کھڑا ہو کر یوں پینترا بنایا جیسے ابھی صدر کے ٹکر مار دے گا۔ صدر نے ڈر کر فوراً ریچھ کا بُت اُن کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے قہر آلود آنکھوں سے صدر کو دیکھا۔ اور پھر مسکرا دیئے۔ سیکرٹری نے ان کی تعریف یوں بیان کی۔

" جناب بھینسا صاحب کو فلم کا فن اپنے آبا و اجداد سے ملا ہے لڑائی کا پارٹ کرنے میں آپ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ جب آپ پردہ سیمیں پہ سینگ تان کر آنکھیں سکیڑ کر منہ سے کف جاری کر کے غصے سے دیکھتے ہیں تو بڑی بڑی ہیروئنوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ ۸۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتے ہیں۔ ایک ہی ٹکر سے

یہ سے بڑے سینما گھر کی دیوار ڈھا سکتے ہیں. پلک جھپکنے میں
ہیرو ہیروئن کے درمیان پہنچ جاتے ہیں. ایک سو کیلے، سو
درجن مالٹے، بارہ تربوز اور ڈیڑھ سو پپیتے ان کے ناشتے
پہ ہوتے ہیں. ان کی خدمت کرتے کرتے ان کی عقل موٹی،
اور ٹانگیں پتلی ہو گئی ہیں"

حاضرین نے تالیاں بجائیں. ایک خرگوش خوشی سے پھدک کر بکری
کے سر پہ بیٹھ گیا. ایک بندر اچھل کر ایک گدھے کی کمر پہ بیٹھ گیا، اور
تالیاں بجانے لگا.

اب سیکریٹری نے سٹوری رائٹر کو سٹیج پہ بلایا.

"میں جناب گینڈا دریا بادی کو انعام وصول کرنے کی دعوت دیتا
ہوں"

اب ایک گنجے سر والا گنجہ سا گینڈا فراخ نتھنوں سے فوں فوں کی
آواز پیدا کرتا بچاس پانوں کا بنڈل کلے میں دبائے انہیں پاگلوں کی
طرح چباتا جگہ جگہ تھوک کے پرنالے چھوڑتا سٹیج پہ آیا. اور انعام
وصول کر کے دو کھڑ اوپر اٹھا کر لہرا کر بولا.

"شکریہ دوستو! میں اس قابل نہیں ہوں لیکن آپ نے بڑی عزت
افزائی کی"

سٹیج سیکریٹری نے آپ کی تعریف میں کہا.

" جناب گینڈا دریا آبادی یہ انعام ان کی بہترین کہانی "محبوب دریائے شور"

کی وجہ سے دیا جا رہا ہے۔ آپ نے یہ کہانی بڑی محنت سے لکھی ہے۔
لکھنے میں گینڈا صاحب کا جواب نہیں۔ آپ جوہڑ یا گھر کے تالاب میں
لیٹ کر کہانی لکھتے ہیں۔ پاتوں کی پوری ایک ٹوکری منہ میں ڈال کر
ایک گھنٹہ اس کی جگالی کرتے ہیں۔ پانچ سیر تمباکو کو حقے میں ڈالکر پیتے
ہیں۔ افیون کا پورا گولہ گلے میں ڈال کر گمٹ ہو جاتے ہیں۔ اس سے پہلے
آپ جنگل میں لکڑ ہارے تھے اور درخت کاٹ کاٹ کر بیچا بھی کرتے تھے۔
اور کھایا بھی کرتے تھے۔ لیکن فلم کی دنیا میں آکر ان کی کایا پلٹ گئی۔ اب
یہ پروڈیوسروں اور فلم دیکھنے والوں کی گردنیں توڑتے ہیں"۔

اس پر گینڈے نے بڑے جوش میں آکر سیکریٹری کو پکڑ کر اس کی
گردن توڑنا چاہی لیکن سٹیج سیکریٹری اس کی ٹانگوں میں سے نکل کر صاحب
صدر کی ٹانگوں میں جا چھپا۔

حاضرین میں سے ایک بکری میں میں کرتی اٹھی اور سٹیج پر آکر گینڈا
صاحب سے لپٹ گئی۔ گینڈا صاحب نے فوراً بکری کو کمر پہ بٹھالیا۔ اور
سٹیج پر سے اتر آئے۔

اتنے میں سارے پنڈال کی بتیاں گل ہو گئیں۔ حاضرین نے شور مچانا
شروع کر دیا۔ نیولے بھاگ گئے۔ خرگوش پھدکنے لگے۔ جگنو دکھلانے لگے۔
بکریاں ممیانے لگیں، گھوڑے ہنہنانے لگے۔ بجلی واپس آئی تو سٹیج سیکریٹری
گھبرائے گھبرائے نظر آنے لگے۔ کیونکہ جس میز پر انعامی مجسمے رکھے ہوئے تھے۔
وہ خالی پڑی تھی۔ سیکریٹری نے روتے ہوئے کہا۔

"پیارے بھائیو! ہمیں افسوس ہے کہ اب ہم باقی انعام نہیں دے سکیں گے کیونکہ کوئی کمینہ میز پر سے باقی سارے انعامی مجسمے اٹھا کر لے گیا ہے"

اس پر سارے پنڈال میں شور مچ اٹھا۔ ابھی گدھوں، گھوڑوں، بکریوں اور کئی میمنوں کو انعام ملنا باقی تھا۔ انہوں نے چیخ چیخ کر تان تان کر کہا۔

"یہ تمہاری آؤ بھگت ہے کمینے! تم نے خود مجسمے گم کر دیئے ہیں۔ ہم تم سے انتقام لیں گے۔ ہم تمہارا حقہ پانی بند کر دیں گے"

اب حاضرین میں سے ان گنت گھوڑے، خچریں، خرگوش اور بکرے سینگ تان کر سٹیج پر دوڑے۔ انہوں نے ہلہ بول دیا، اور سیکرٹری اور صدر کو اٹھا کر عید گاہ کے پنڈال سے باہر گندے نالے میں پھینک دیا۔

ختم شد